حرفِ اقبالؒ

یعنی

اقبالؒ کے خطبات، تقاریر اور بیانات کا مجموعہ

المنار اکادمی
لاہور

نومبر ۱۹۴۵ء

تعداد ایکہزار

قیمت تین روپے بارہ آنے (۳ سے)

ایم، حمید اللہ خان مینیجر المنار اکادمی" نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر، ۲۶ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

صفحہ

حصّہ اول: خُطبات اور تقاریر

صفحہ

حصہ دوئم: اسلام اور قادیانیت

حصہ سوئم: متفرق بیانات

صفحہ

صفحہ

دیباچہ

علامہ اقبال کے باقیاتِ ادب دو خطبات، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی چند تقاریر اور متعدد اخباری بیانات پر مشتمل ہیں۔ یہ سب مواد چھوٹے چھوٹے کتابچوں، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی روداوں اور اخبارات کے فائلوں میں منتشر تھا۔ چونکہ ان جواہر پاروں کے ضائع ہونے کا سخت اندیشہ تھا، مؤلف نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ میں عقیدتمندانِ اقبال سے اس مجموعہ کے لئے خیر مقدم کی توقع رکھتا ہوں۔

علامہ مرحوم ہمہ گیر مفکر یا انشا پرداز نہ تھے۔ پبلک پلیٹ فارم سے وہ شاذ و نادر ہی بولتے تھے۔ ان کے بیانات کی تعداد بھی چند سے زیادہ نہیں۔ وہ صرف اس وقت بولتے تھے جب انہیں کوئی تعمیری یا ٹھوس بات کہنی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انکے بیانات واقعات حاضرہ پر مبنی ہونیکے باوجود اپنے اندر دوامی دلچسپی رکھتے تھے۔

اقبال ایک سیاستدان نہ تھے۔ اس حقیقت کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ ان کا دماغ ان سازشوں، چالبازیوں اور عیاریوں سے پاک تھا جو عام سیاستدانوں

کا ذہنی اور اخلاقی سرمایہ ہیں۔ اسلام کا مطالعہ انکی زندگی کا اولین مقصد تھا بلکہ ان کی زندگی کا واحد مشغلہ ہی یہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا "میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلامی قانون، تمدن، تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ میں صرف کیا ہے"۔

اسلام محض اعتقادات کے مجموعہ کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور سیاسی فلسفہ اس کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے۔ اس لئے مرحوم سیاسی فکر پر مجبور تھے۔ دراصل جو خصوصیت انہیں دیگر مفکرین اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی ہے کہ انہوں نے اسلام کا وسیع اور ہمدردانہ نظر سے مطالعہ کیا اور اسے ایک مکمل وحدت کی شکل دی۔

مرحوم اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ "سیاست کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے"۔ اور یہ کہ "افراد اور اقوام کی زندگی میں مذہب ایک نہایت اہم جزو ہے"۔ ایسے دور میں جبکہ ہندوستان اور بیرون ہند کا فرد گلا پھاڑ کر پھاڑ کر یہ بات ثابت کرنے کے لئے چلا رہا تھا کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے، علامہ مرحوم نے یہ اعلان کرنے کی جرأت کی کہ سیاست اور مذہب کی علیحدگی انسان کی انتہائی بد قسمتی کی علامت ہے اور یہ ان دونوں کی علیحدگی ہی ہے جو تہذیب کے تمام ڈھانچے کو تباہی کے غار میں گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اسلام ہی واحد وجہ استقلال ہے۔ علامہ مرحوم اسلام سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس دور کی جملہ سیاسی، مذہبی اور تمدنی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان کا ارشاد ہے۔

"سیاسیات سے میری دلچسپی بھی اسی وجہ سے ہے کہ آجکل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور فطرت پر غالباً اثر انداز ہونگے"

روحانی اور دنیوی زندگی کے رابطہ کا احساس کرتے ہوئے علامہ نے ہندی مسلمانوں کے سیاسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔ "ایک مدت مدید سے ہندی مسلمان نے اپنی اندرونی کیفیت کی گہرائیوں کو ٹٹولنا چھوڑ رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی پوری تابندگی اور آب و تاب کو دیکھ نہیں پاتا اور اسی لئے یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان قوتوں کے ساتھ بزدلانہ صلح پر تیار ہو جائیگا جو اسکے نزدیک ناقابل عبور ہیں"

مسلم لیگ کی تحریک کے ذریعے اسلامیانِ ہند میں اب کافی تبدیلی آچکی ہے۔ لیکن قبل از ۱۹۳۷ء جو مسلمانانِ ہند کی بیداری کا پہلا سال کہا جا سکتا ہے ہندی مسلمانوں کی سیاست محض ایک بزدلانہ سمجھوتہ ہی کہی جا سکتی ہے۔ ہم میں سے ایک عنصر کا کھلم کھلا اعلان تھا کہ ہماری خیریت انگریز کی سرپرستی میں ہے۔ دوسرا عنصر جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ خیال کرتا تھا یہ سمجھتا تھا کہ ہندو اکثریت کے ساتھ جس کی نمائندگی انڈین نیشنل کانگرس کرتی ہے، سمجھوتہ بلکہ اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی ہماری نجات کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مختصر سا گروہ ایسا بھی تھا جو مسلمانوں کو بجائے خود ایک ایسی قوم تصور کرتا تھا جس کا اپنا تمدن ہے اور اپنے سیاسی نظریات۔ علامہ کے خیالات ایسے لوگوں کا سہارا تھے۔

روحانی زندگی کی تلاش کے متعلق علامہ کے ارشادات آج بھی اتنے ہی

وقیع ہیں جتنے اس وقت تھے اور ہماری خرابی کی اصلاح کے لئے جو تجویز
انہوں نے اس وقت کی تھی وہ آج بھی اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ مسلمان
اس پر نہایت سنجیدگی سے عمل کرے۔ انکی تجویز تھی کہ "ملک کے تمام بڑے بڑے
قصبوں میں مردوں اور عورتوں کے تمدنی ادارے قائم کئے جائیں لیکن ان اداروں
کا سیاسی مسائل سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کا اہم مقصد یہی ہو کہ وہ
اگلی نسل کی خوابیدہ قوتوں کو مجتمع کریں۔ انہیں اسلام کی گزشتہ فتوحات یاد دلائیں
اور یہ بتلائیں کہ عالم انسانیت کی مذہبی اور تمدنی زندگی میں اسلام نے ابھی کیا کچھ
کرنا ہے۔ عوام کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ان
کے سامنے کوئی نیا کام رکھا جائے جو فرد کو پوری جماعت پر نظر ڈالنے کی توفیق
بخشے۔ اور جب یہ قوتیں ایک بار بیدار ہو جائیں تو وہ اپنے ساتھ نئی کشمکش کے
لئے تازہ دم لاتی ہیں اور ایک ایسی باطنی آزادی جو نہ محض کشمکش کو پسند کرتی
ہے بلکہ حیات نو کی خبر بھی دیتی ہے۔"

سیاستدان ہوا کے رخ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلم رہنماؤں
کی اکثریت خصوصاً اس مرض میں مبتلا ہے۔ یہ حضرات ایسے دور کی پیداوار
ہیں جبکہ اسلامیان ہند کی صرف یہ پالیسی تھی کہ انگریز یا کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ
کر لیا جائے۔ اپنے قومی امتیاز کا انہیں قطعاً احساس نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب
تک قوم کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں رہے مسلم مفاد ہمیشہ خطرہ میں رہے گا۔
قوم اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے۔ جب عوام اتنے روشن خیال اور منظم ہو جائیں
کہ وہ اپنی قسمت اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔ علامہ مرحوم کی مجوزہ تمدنی درسگاہوں

کا قیام اس قسم کی روشن خیالی پیدا کرنے کا موثر ترین طریقہ ہے۔
سیاست دان بعض اوقات سیاسی طاقت کے حصول ہی کو منتہائے مقصود سمجھ بیٹھتے ہیں اور ہمارے سیاست دانوں میں بہت سے حضرات اس قسم کے ہونگے جن کے نزدیک پاکستان محض ہندوؤں کی غلامی سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کا خطرہ یا مسلمانوں کے لئے مادی فوائد کا حصول ہی ان کی سیاست کی بنیاد ہے۔ علامہ مرحوم کے خیالات چونکہ جذبہ اسلامی سے پُر تھے۔ اس لئے حصول قوت یا مادی فوائد میں ان کے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ انہوں نے شمال مغربی ہندوستان میں ایک علیحدہ اور آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ ہندوؤں کی غلامی سے بچنے کیلئے نہیں کیا۔ انکے مطالبہ کی غایت یہ تھی کہ مسلمان صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکیں اور "خیر اُمت" کی بنیاد رکھ سکیں۔ علامہ کے خیال میں ایسی آزاد ریاست سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

جہاں تک نظریہ پاکستان کا تعلق ہے مسلم لیگ اور علامہ اقبال کے نظریے میں قطعاً تضاد نہیں۔ علامہ ایک نصب العین پیش کر کے یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان ایک آزاد مسلم ریاست بالآخر کن مقاصد کو پورا کریگی۔ مسلم لیگ کا مقصد اسی قسم کی ریاست کا قیام ہے کیونکہ اس کے بغیر مذکورۃ الصدر مقاصد کی تکمیل ممکن نہیں۔ ریاست

کے حصول کے بعد اگر مسلمان اسلام اور اس کے بلند مقاصد پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس ریاست کے ذریعہ ان مقاصد کو حاصل کریں۔ مقام مسرت ہے کہ مسلمان کا رجحان اب اس طرف ہو چکا ہے۔

اس دیباچہ میں ان تمام تقاریر اور بیانات کے جو اس جلد میں شامل ہیں مفصل تبصرہ کرنا مؤلف کا مقصود نہیں۔ میرا منشا محض اس قدر ہے کہ یہ تقاریر اور بیانات اسلامیان ہند کے لیے ایسے سیاسی اور تمدنی معاملات کے حامل ہیں جو نہ صرف ان کی موجودہ سیاسی کشمکش بلکہ عرصہ دراز تک ان کا تمدنی اور روحانی ترقی کے لئے شمع ہدایت کا کام دیں گے۔ مفکرین اسلام میں اقبال کی جگہ صف اول میں ہے اور علامہ کے ارشادات کو ہم اس نازک وقت میں ہرگز نظر انداز یا فراموش نہیں کر سکتے۔

کتاب میں مختلف مقامات پر مؤلف نے حاشیے بڑھا دیے ہیں۔ امید ہے کہ ان سے علامہ کے بعض الفاظ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ مؤلف ان حضرات اور دوستوں کا بے حد شکر گزار ہے جنہوں نے علامہ مرحوم کی تقاریر اور بیانات کو یکجا کرنے اور انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کرنے میں امداد دی ہے۔

"شاملو" — ۱۹ر جنوری ۱۹۴۵ء

حصّۂ اوّل

خُطبات اور تقاریر

حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہیں۔ اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کے لئے زندہ رہے اور ان کے لئے ہی مرے۔ نہ زمین کے اس ٹکڑے کے لئے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔

خطبۂ صدارت جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس

منعقدہ الٰہ آباد میں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو پڑھا گیا

حضرات! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایسے وقت
میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانانِ
ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔
مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ
مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔
لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر میں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے آج یہ
حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی راہ نمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت
کا رہنما نہیں، نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام
اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا
ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت، جو مجھے تعلیماتِ اسلامی
کی روح سے جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے، میں نے
اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار
سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانانِ ہندوستان

۱؎ مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب

بہرحال اپنی اسلامی رُوح کو برقرار رکھنے پر منحصر ہیں، میں کوشش کروں گا کہ
آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں، خواہ اس کی
قدر و قیمت کچھ بھی ہو، آپ کے دل میں ان بنیادی اصولوں کا احساس پیدا
کر دوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیے۔
یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور
نظامِ سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس
کا نظم و انضباط کسی نظامِ قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو اور جس کے اندر ایک
مخصوص اخلاقی رُوح سرگرمِ کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا
جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں
کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دار
و مدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین
قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا
ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دُنیا بھر میں شاید ہندوستان
ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہُوا
ہے۔ دُوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعتِ اسلامی کی ترکیب
صرف اسلام ہی کی رہینِ منت ہے۔ کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص
اخلاقی رُوح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد
اور اُن کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندۂ احسان ہے جو
تہذیبِ اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار

نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دُنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشو و نما پایا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی، کیونکہ اس قسم کا نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے۔ اور لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دُنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا، اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں، اس نئے تخیل حیات کے لیے انہیں ایک کہیں زیادہ واقعی اور مرئی احساس

مثلاً تصوّرِ وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی
نظامات کی شکل میں ہوا جنہوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔
یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ
وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے
کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے اور انسان کی دنیوی زندگی سے اسے
کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔
مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ
اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب
بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک
محدود ہے، اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک
ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے، وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل
اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا
اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان
کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی
دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی
اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا
ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت
کے زیر اثر قبول کر لیا ہے۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس
ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح

سے اب بھی مصر ہے کہ دُنیا اس اصُول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل یہ رُوحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جن سے یورپ کی مسیحائی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں۔ جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں بالفعل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا، انہوں نے لوتھر کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہرحال دُنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنہ متوسطہ کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور لہذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں، لہذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور

قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہوگا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اس طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا یا یہ کہ خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنک نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے، اور اسی طرح اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے بالکل مخالف ہی نہیں بلکہ اُن سے بالکل متضاد ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ

اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے، جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطہ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ جس مسئلہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے۔ جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا اُن کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قدم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلہ پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے میں اُن سے بیکار ردو مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزو مند ہیں۔ میرا

مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق میں نے جو رائے قائم
کی ہے اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی
ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد
کی روشنی میں منور کر سکوں۔

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت
کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں
کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی
حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو
بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی
بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی
امکان باقی نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔
کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات
محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز
معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور یہی تھا کہ وہ
ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے ادیات سے منہ موڑ کر اپنی
تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً
وہی نتیجہ مترتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن
آنحضرت کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں اُن کا
اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہیں یہ محض حیاتی نوع کی واردات

نہیں ہیں جن کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہذا اسلام کے مذہبی نصب العین کا اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا، جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو، یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہندوستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں

جذبات کی گرمی سے تو انہیں کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے۔ اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جماعتوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو ریان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان میں کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا، خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں، اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعۃً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف

اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک و تعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں، جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور ہم باطناً تغلب و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں، اُن سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی رواداراں حب الوطنی کا ادعا ہے، لیکن دلوں میں ذات پات

کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول
کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ
اپنی تہذیب و تمدن کے نشو و نما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔
لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز
ہے۔ واقعات کا رجحان بہر کیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی
کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں
مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیہ کے اس
بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جاوے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و
تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے
وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ یہ
اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق
آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ داری پر مبنی نہیں۔ فرقہ داری کی بھی
بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی
بدخواہی کی تعلیم دے، اس کے ذلیل اور ادنے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات
کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت
پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت
کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع
و اطوار اور میری زندگی کا سر چشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب،

اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا، جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ داری کے اسی پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :-

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ دارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں، بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کے گرم سے گرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر (اور یاد رکھئے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ داری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں) ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔"

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو۔ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے

جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ان کے
اعمال و افعال ہیں، وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد
میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی کوئی واحد الجنس قوم نہیں
پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے
بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔ لہذا مسلمانوں کا
مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق
بجانب ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی
بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے
وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ
وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔
مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں
نہایت شد و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی
ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد،
سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست
سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے
باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں
کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا۔
لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا
رقبہ اسقدر وسیع ہوگا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائیگا۔ بیشک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے

تو ارا کین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آبادی پر نظر کی جائے۔ تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دُوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وُسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سُن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دُنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وُہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرسکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقے کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقعہ دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صدی ہے لیکن ہندوستان کی پُوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فی صدی ہے

اور اگر عساکرِ ہند کی کُل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد
ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی کُل تعداد
۶۱ فی صدی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس اندازے میں وہ ۶ ہزار جنگجو شامل نہیں
جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان
تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان
کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی
چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہیں۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس
شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ
خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں، ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے
کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومتِ ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض
کر دوں گا کہ مسلمانانِ ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔
ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ
قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے
قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو
دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ ہو جائے۔

بہر حال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آزاد
اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔
میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا
چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار

رو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہے۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک رُوحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے۔ اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سُود کے متعلّق قوانین بنائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے اسلامی حکومت نے شرحِ سُود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ مَیں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح اور بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہُوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اسی جمُود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وُہ زمانہ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے لسانی اور عقائد و معاشرت کے بیشمار اختلافات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں ابھی آزاد ریاستیں

قائم کر دی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے
اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا
گیا ہے اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب
عوام سے عمل میں نہ آئے۔ بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل
ہو۔ سائمن رپورٹ کی رُو سے تقریباً ان ہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے
کیا ہے، صوبوں کی تقسیم بھی از سر نو ہو جانی چاہیے۔ میں ان دونوں تجویزوں
کی دل سے تائید کرتا ہوں۔ بلکہ اُس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ
صوبوں کی جدید تقسیم سے پیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے۔ اولاً
یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیے۔ ثانیاً اسی کی نوعیت
ایسی ہو کہ اس سے فرقہ دارانہ مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اگر
صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہوگی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات
کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سارے جھگڑے
کی بنا صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخابات
کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ اُن کے نزدیک لفظ "قومیت" کا مفہوم
صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط
ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن
ہندوستان کی یہ حالت نہیں۔ نہ ہم اس کے آرزومند ہیں۔ ہندوستان میں
مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں
کی معاشی پستی، ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض

صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کو سمجھ میں آجائیگا
کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان ایسے
ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اسی امر
کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملت کے مفاد کی پوری پوری
نمائندگی ہو سکے گی، ناممکن ہے۔ سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں
کا تغلب قائم ہو جائے۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت
عمل میں آجائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں،
اور ان کی نسل، اُن کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو
تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے۔
ہندو اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور حکومت طیار کیا ہے اس سے اس بارے
اختلاف کا پتہ چل جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے ہندوستان
کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں ہر گز
بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مرکزی
مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جاوے جس میں اس وقت بھی
انہیں کی کثرت ہے۔ اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہو تو یہ کثرت
اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے محسوس
کر لیا ہے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا تو اس کا
نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہوگا کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت

ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی) یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ
صوبوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول
پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی
ہیں۔ لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے
بالکل مختلف ہے، جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈریشن
کا مطالبہ محض اس لئے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیئے کی صرف یہی
ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں
فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولی طور سے کسی قدر بھی درست اور محکم کیوں
نہ ہو اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا
مشکل ہے۔ ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے
ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ
نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی غور نہیں کیا بلکہ اسے ویسے
ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے
سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی ہے۔ نہرو رپورٹ
نے محض اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجالس وضع قوانین میں ہندوؤں
کی اکثریت ہے، وحدانی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان
پر بآسانی ہندوؤں کا غلبہ قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک
لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہے جس کی تہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور

قائم رہے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز طبعًا اس اقتدار سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل ہو رہا ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو سکا تو ان کو ہندوستان پر مستقلانہ اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ مَیں تو اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں وحدانی حکومت قائم ہو۔ جن اختیارات کو "فاضل" (Residuary) کہا جاتا ہے وہ صرف آزاد ریاستوں کو ملنے چاہئیں مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمے صرف ایسے اختیارات رہنے چاہئیں جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیب خاطر اس کے سپرد کر دیں۔ مَیں مسلمانان ہندوستان کو کبھی یہ رائے نہیں دُوں گا کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی، اظہار اتفاق کریں جو حقیقی فیڈریشن کے اصُول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

پیشتر اس کے کہ انگریزی مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی موثر ذریعہ اختیار کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر الامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی ضرورت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے باشندگان ہندوستان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہُوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندوستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین سے جواب تک وحدانی حکومت کے طرف دار چلے آتے تھے بغیر کسی تکلف کے

فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے، جب شاستری صاحب نے سر جان سائمن کی فیڈریشن والی سکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن دفعتہً وہ بھی فیڈریشن پر رضامند ہو گئے۔ اور اپنی رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس ہی میں کر دیا جس سے وزیر اعظم انگلستان کو موقعہ ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علّت نہیں۔ انگریزوں نے والیان ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے، جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے، دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے۔ دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے، انگریز مدبّرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیانِ ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس سکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصہ میں کالعدم ہو جائیگا۔ کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیانِ ریاست کی اکثریت ہو گی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولتِ برطانیہ کے

مفاد کا سوال در پیش ہوگا تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان میں قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا (یعنی ہندوؤں کا) غلبہ ہوگا۔ لہٰذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری جماعت سے ہوں یا مزدور جماعت سے حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳ فی صدی نشستیں حاصل ہوں، اسی ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت

کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ البتہ رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے۔ اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہوگی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمے نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانوی علاقے تک محدود ہوتی۔ کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو استبداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو، سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدتی حکومت کا تختہ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت، ممکن ہے، کہ انگریزوں کے لئے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لئے بھی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے لئے فائدے کی کوئی توقع رکھنا بے سود ہے جب تک کہ انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے "فاضل" اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہو جائیں اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ ملیں جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ (Sovereign) اختیارات کا تعلق ہے۔ ہز ہائی نس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیانِ

ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہیئے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا۔ بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں، ہمیں تمام فیڈریشن میں ایک تہائی نشستیں حاصل ہوں۔

ہندوستان میں فیڈرل حکومت قائم کرنے میں ایک بڑی دقت دفاع اور حفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے تاکہ جنگی نظم و نسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو نہ اب، نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے"

کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں، برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی؟۔ موجودہ حالت میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول

کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں اُن کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندوستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا، معرض خطر میں آجائے گی۔ اپنے بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان، جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، ایک تصادم رُونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ:

"یہ حقیقت، کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں، اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے"

اس مسئلے کو ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں بلکہ وُہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہرحال فیڈریشن میں جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائے گا، یعنی ہندوستان کے خارجی تحفظ کا۔ صوبجاتی عساکر کے علاوہ، جو ہندوستان کے اندرونی امن و سکون کے لئے ناگزیر ہیں، ہندوستان کی فیڈرل کانگریس صوبہ سرحد میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کر

سکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہوگی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں اور یہی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھا کر اراکین کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم و نسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا جس سے خود ان کا یہ اندازہ قابل اعتراض نظر آتا ہے۔

"اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد ۲۵ ہے معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں تب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کا اکثر حصہ سینڈھرسٹ نہیں گیا بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا"

اب یہ خواہش، کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے، کس قدر سچی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اسکین کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت موثر طریق پر ان الفاظ میں جمع کر دیا ہے۔

"ترقی اس پر منحصر نہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً سست

رہے گی۔ موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں اور ان
کا تجربہ محدود ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصہ کے اندر اعلیٰ مراتب
حاصل کر لیں۔ جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ
ہو جائے اور ہم اس اضافے کے دل سے خواہشمند ہیں، جب تک ہندوستانیوں
کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے کہ جس سے سب
نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر ہندوستانی ہوں۔ جب تک یہ رجمنٹیں
عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے
کا ایک ہی ذریعہ ہے اس وقت تک یہ ممکن نہ ہوگا کہ فوج کے نظم و نسق کو
ہندوستانیوں کے ذمے سپرد کر دیا جائے۔ اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے
کہ ساری فوج کلیتہً ہندوستانی ہو جائے۔ اس حالت میں بھی اس کام
کی تکمیل کے لئے ایک طویل عرصہ کی ضرورت ہوگی۔"

اب میں یہ اعتراض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس صورتِ حالات کا
ذمہ دار کون ہے؟ اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے یا
فوجی تعلیم کی سست رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلم ہے۔ البتہ یہ
ممکن ہے کہ بہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے جنگی تعلیم کا عمل سست
ہو۔ میں عسکریات کا ماہر نہیں۔ لیکن عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں
کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل
ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہ ہوگی۔ لہٰذا ضروری
ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم و نسق ایک دفاعی کمیٹی

کے ذمّے کر دیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیہ سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کے بحری تحفّظ کے متعلّق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں لیکن یہ امر بھی مسلّم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر فیڈرل ریاست قائم ہو گئی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفّظ کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام کے لئے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو، ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدار عساکر واقعۃً موجود تھے۔ بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظامِ حکومت میں ایک غیر جانبدارانہ ہندوستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبات حُبّ الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے حملہ ہوا تو مسلمانانِ ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

میں نے مختصراً اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان کے دو آئینی مسئلوں کے متعلّق ہم مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟ ہمارا

سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ دارانہ مسائل کے مستقل تصفیئے کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم ازسرِنو ہو جائے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر ہمیں نہایت شد و مد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بار بار کیا گیا ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ ناعاقبت اندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔ اس کا مطالبہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق

جو یادداشت بھیجی ہے اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ کی
اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ان دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو
بھی پسند نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا
ہے کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا حق
کیوں نہیں دیا گیا۔ محض یہ امر کہ انہیں دوسرے صوبوں میں "پاسنگ" حاصل
ہے، اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس
یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔
جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ حکومت ہند نے بھی اسی "نہایت احتیاط سے
تیار کی ہوئی متوازن اسکیم" کی حمایت کی ہے جس کو پنجاب کونسل کے سرکاری
ممبروں نے مرتب کیا تھا۔ اور جس کے ماتحت مسلمانان پنجاب کو پوری مجلس
میں صرف ۴۹ فی صدی نشستیں ملتی ہیں اور ہندو اور سکھ ارا کین
پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے
خود اس قدر فیصلہ کن ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
مسلمانان پنجاب کسی ایسی سکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے انہیں
پوری مجلس میں قطعی اکثریت حاصل نہ ہو جائے۔ بہر حال لارڈ ارون
اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہندگی
اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب آبادی واضح طور پر اس
کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے۔ اور جب تک تمام مسلمان بالاتفاق رائے
جداگانہ نمائندگی کے حق سے دست بردار نہ ہو جائیں ہندوستان کی اقلیتیں

اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تک حکومت ہند کے نزدیک مسلمانوں کی شکایت بجا ہے تو اسے اتنی جرأت کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی۔

مسلمانان ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہوگا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے۔ یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیئے۔ احاطۂ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے، نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ ملک ہے جو ممالکِ اسلامی سے قریب تر ہے"، سب سے پہلے اُموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ عرب کی جانب۔ مناسب ردو بدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں، اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ

رکھ لیا جائے اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا تو صاف نظر آتا ہے کہ اس کو احاطۂ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دُور ہے۔ بے شک اس وقت بمبئی کا رویّہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند امّید افزا صُوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔ رہا شمال مغربی سرحدی صُوبہ، سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صُوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات بریّے کمیٹی سے بھی کم ہیں۔ اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں، محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارُود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل کسی قدر بھی لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے، نہ کہ آگ کی۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں، خواہ وہ خانۂ بارُود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر

اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت
کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو
اُن کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا
ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ گذشتہ ایام میں
اسی بد قسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آ چکے ہیں وہ محض
اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں، جو ہندوستان میں
اصُول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر اب تک اس سے روا رکھا
گیا ہے مجھے اُمید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں
غلطی نہیں کریں گے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں
رکھیں گے کہ اس صوبہ میں جو کچھ پیش آ رہا ہے خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے اپنی یادداشت میں صوبہ سرحد کے لئے جن
اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہیں۔ بے شک ان کا دائرہ کمیشن
کی سفارشات سے وسیع ہے۔ کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل
اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز کی گئی ہے لیکن حکومت ہند نے بھی اِس
صُوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دُوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔
حالانکہ افغان جبلتًا اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے
دُوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصّہ لیں۔

میرا خیال ہے کہ اب مجھے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری
اشارات کر دینے چاہئیں۔ ذاتی طور پر مجھے اس کانفرنس سے کوئی اُمید

وابستہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا تھا کہ فرقہ دارانہ رزمگاہ سے دور
ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوشمندی سے کام لیں گے۔
لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ فرقہ دارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے
اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح
ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ وزیر اعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان
میں مسئلہ بین الاقوامی ہے، قومی نہیں۔ انہوں نے کہا ہے "یہ ایک
دشوار بات ہوگی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخابات
کی تجاویز پیش کرے۔ اس لئے کہ مخلوط انتخابات انگریزی جذبات
جمہوریت پسندی کے زیادہ قریب ہیں۔" انہوں نے اس امر پر غور
نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں۔ برطانوی جمہوریت
کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اس مسئلے کو جغرافیائی
اصول پر حل کیا جائے۔ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ
بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح
نتیجے پر پہنچے۔ آخر الامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا۔
ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمائندے اس مسئلے کو محض
مسلمانہ نقطوں سے نہیں دیکھیں گے جیسا کہ اب تک ہندوستان کے
اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملہ کی تہ تک
پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کریں گے کہ ہندوستان کے اندر امن نہ

سکون کے قیام کا طریق کیا ہے۔ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہوگا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے، یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں، اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے، اس ملک میں اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ دارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی رہنما کو اس طعن آمیز لفظ (یعنی "فرقہ داری") کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیئے، جسے ہندو محض پروپیگنڈے کی خاطر استعمال کر رہے ہیں، تاکہ بقول وزیر اعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور انگریز ہندوستان میں ایک ایسی صورت حالات فرض کر لیں، جو واقعتہً موجود نہیں۔ اس وقت بڑے بڑے مفاد خطرے میں پڑے ہیں۔ ہماری تعداد سات کروڑ ہے اور ہم ہندوستان

کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ صرف مسلمان ہی ہے۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں۔ لیکن اب بھی ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بیشک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں وارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر نہیں ہونا چاہیئے کہ ترکی، ایران، اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانان ہندوستان کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق باصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھو لے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رُو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحاد نوع انسان کی خاطر اٹھایا۔ اس سے ان لوگوں کو جن کا سیاسی نصب العین تقریباً ایک سا تھا باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ (یعنی توحید) سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ... الخ. یہ الگ

باوجودیکہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدال اور تہذیب مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقعہ نہیں دیا کہ دنیائے اسلام اس آیت کے لا انتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلادِ اسلامیہ میں بتدریج اسلامی قومیت کی تشکیل میں پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس امر سے کر سکتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہوگا۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ہو کر کوئی آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہیں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوتوں سے آشنا ہو گئے ہیں جو ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ قسمت کی تشکیل میں کارفرما ہیں۔ لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھتا ہوں کہ کیا اس غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت آئے تو ہم اپنے آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار پائیں جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلا تکلف کہہ دینا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے

کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ آرون کی تشخیص بالکل صحیح
تھی جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملت
اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد
ہیں جن کو اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ
ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے
دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار
کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت
عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے،
یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج
متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں۔ اور اس
سے قوم کے عام افکار اور اس کے عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا
جو طرز عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا ہے، اب وہی سیاسیات میں
ہو گیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ
ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے
جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید براں یہ اصول اس قدر وسیع
ہے کہ کسی فرقے کو اس قدر جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کی حدود
ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات
کو جائز رکھا گیا۔ بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل
کی ضرورت ہے، تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

لہذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے؟
اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفعیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اسی موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ میں اس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حالات پیدا نہ ہو جائے، جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں، فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں، اور صرف قرار دادیں ہی منظور نہ کریں، بلکہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے لئے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ میں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لئے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دور میں سے گزر رہے ہیں، اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملی وجود کی بقا اور ہندوستان کا مفاد صرف اسی امر سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے، جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر

ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے۔ اور ایک فرض ایشیا، بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے۔ اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے، لہذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ہندوستان کے مسئلے پر محض اسلامی زاویہ نگہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بھی غور کریں۔
ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہیں کرلیں گے۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں، دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ میں فرقہ دارانہ مسائل کے تصفیئے سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو۔ اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشو و نما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں۔

فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جائیں۔ اور پھر اس نصب العین
کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے، اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال
کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے۔ خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔
مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح
نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے
سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی
کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی
نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں، تو
آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت
و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت
یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے
جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان، جو بجا طور پر یہ دعویٰ
کر سکتے ہیں کہ یہ ہمیں تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور
پر عمل پیرا ہوئے۔ ایک نفس واحد کی طرح زندہ رہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ
ہندوستان کی حالت وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں
کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنے آپ پر اس
وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ اُن کے مشاہدے کیلئے ایک صحیح اجتماعی انا پیدا
کر لیں گے: عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵: ۱۰۵)

خطبۂ صدارت جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس

منعقدہ لاہور میں ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء کو پڑھا گیا۔

حضرات! ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی تقریریں سننے کا اتنا اتفاق ہوا ہے کہ ان کا ہیجان زدہ طبقہ تو ایسے بیانات کو پژمردہ نگاہوں سے دیکھنے لگا ہے۔ ان کے نزدیک ہماری یہ کارروائیاں اس قوت عمل کو جو روح اسلام میں مضمر ہے، کمزور کر دیتی ہیں اور بالآخر کچلنے کا کام دیتی ہیں۔ ایک کہتا ہے: "ملک کی موجودہ حالت ہمارے جوش عمل کے لئے تازیانہ کا حکم رکھتی ہے۔ اور اگر ہمارے رہنما ہندی مسلمانوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر کوئی راہ عمل متعین نہ کر سکے۔ تو ہمارے نوجوان فرط تقلید سے مجبور ہو کر اپنے کو حالات کے بہاؤ پر ڈال دیں گے۔" ایک اور صاحب نوجوانی کے مخصوص بے تابانہ جذبہ کے ساتھ کہتے ہیں۔ "عمل کسی تدبیر کا محتاج نہیں۔ نہ ہی اسے درسی منطق کی ضرورت ہے۔ وہ جب قلب انسانی سے نکل کر کھلی فضا میں آتا ہے۔ تو اپنا منطق اپنے ساتھ لاتا ہے۔" یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی موجودہ نفسیاتی کیفیت۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ایسے نازک وقت میں مجھ پر اعتماد کیا۔ لیکن ایک ایسے شخص کے انتخاب پر جو محض تخیل پرست

ہو، میں آپ کو مبارک باد پیش نہیں کر سکتا۔ آپ شاید سمجھتے ہوں کہ ایسے
دور میں تخیل پرست ہی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بصیرت (Vision) کے
بغیر زندگی محال ہے۔ یا شاید آپ کا خیال ہو کہ لندن کانفرنس کے تجربات
کے بعد میں اس مسند صدارت کے لئے زیادہ موزون ہو گیا ہوں۔ واقعہ کچھ
ہی ہو۔ لیکن یاد رکھئے کہ کسی نصب العین کو اس کی عملی قیود سے آزاد کر کے
ظاہر کرنا ایک الگ منصب ہے۔ مگر ایسے نصب العین کو زندہ حقیقت میں
بدل دینے کی رہنمائی کرنا بالکل دوسرا کام ہے۔ اب اگر کوئی شخص طبعاً پہلے
منصب کے لئے موزون ہو، تو اس کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں
ان عملی مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ جو ایک مدبر کو ہر قدم پر پیش آتی
ہیں۔ جو شخص پہلے منصب کے ساتھ دوسرے کو بھی انجام دینا چاہتا ہے،
اُسے ہر لحظہ ان سب حدود کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ جسے پہلی صورت میں وہ
نظر انداز کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ایسا شخص بدقسمتی سے ایک مستقل ذہنی
کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اور بسا اوقات اس پر تناقض بالذات کا الزام
بھی عائد ہو سکتا ہے۔ بہرکیف میں اس دشوار فرض کو خوشی سے قبول کرتا
ہوں۔ اس لئے نہیں کہ اپنے کو اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس بنا پر کہ
خوش قسمتی سے تمام زیر بحث مسائل اب اس قدر واضح ہو چکے ہیں کہ
معاملہ کا انحصار کسی فرد کی رہنمائی پر نہیں۔ بلکہ تمام انفرادی عزائم کی
یک جہتی پر ہے۔

سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ

ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے یا
پھر سوک چرچ (Civic Church) سیاسیات میں میری دلچسپی بھی دراصل
اسی وجہ سے ہے۔ آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصوّرات جو شکل اختیار
کر رہے ہیں۔ وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور فطرت پر غالباً
اثر انداز ہوں گے۔ میں یورپ کی وطنیت کا مخالف ہوں، اس لئے نہیں
کہ اگر اسے ہندوستان میں نشو و نما پانے کا موقع ملے، تو مسلمانوں کو مادی
فوائد کم پہنچیں گے۔ میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس کے اندر
ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں۔ جو میرے نزدیک انسانیت
کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔ حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور
انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت
اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے۔ اور میری
نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان اُن کے لئے زندہ رہے اور اُن
ہی کے لئے مرے۔ نہ زمین کے اس ٹکڑہ کے لئے جس سے اس کی رُوح
کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی بیشمار جماعتوں کے باہمی
ائتلاف کے تمام ظاہر یا پوشیدہ محلّات کی بنا پر میں یقین رکھتا ہوں کہ یہاں
ایک ایسے مربوط کل کی تشکیل کا امکان ہے۔ جس کی وحدت کو اس کا
اندرونی تنوع درہم برہم نہ کر سکے۔ قدیم ہندی فکر کے سامنے یہ مسئلہ درپیش
تھا کہ ایک وجود سے اس کی وحدت پر اثر انداز ہوئے بغیر تنوع کیسے پیدا
ہو گیا۔ آج یہ مسئلہ اپنی اخلاقی بلندیوں سے اتر کر گشت سیاسی سطح پر آ چکا

ہے اور ہمیں اس کی برعکس صورت کا حل سوچنا ہے۔ یعنی کثرت اپنا مزاج کھوئے بغیر وحدت میں کیسے تبدیل ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ہماری بنیادی پالیسی کا تعلق ہے میرے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں، میں آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ موجودہ تقریر میں اور باتوں کے علاوہ میرا ارادہ ہے کہ ایک تو ان حالات کا صحیح جائزہ لینے میں آپ کی مدد کروں۔ جو گول میز کانفرنس کی آخری مباحث کے ایام میں ہمارے نمائندوں کے مذبذب رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ دوسرے اب جبکہ لندن کانفرنس کے بعد وزیر اعظم کی تقریر نے تمام صورت حالات کا جائزہ لینے پر مجبور کیا ہے۔ میں اپنی دانست کے مطابق ایک نئی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کروں گا۔ نمائندوں کی کارگزاری کی مختصر روئداد سے میں اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں۔

اقلیت کمیٹی کی پہلی دو نشستیں ۲۸ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوئیں۔ دونوں موقعوں پر فرقہ وارانہ مسئلہ کو پرائیویٹ طریق پر سلجھانے کی خاطر مجلس کو ملتوی کرنا پڑا۔ مہاتما گاندھی نے مسلم نمائندوں سے پہلے تو یہ کہا کہ جب تک ڈاکٹر انصاری سے پابندیاں نہ اٹھائی جائیں گی، معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہاں ناکام ہونے پر انہوں نے مسلم نمائندوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ وہ ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات مان لیں گے اور کانگریس، ہندوؤں اور سکھوں کو بھی متفق کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر مسلمان تین شرطیں

قبول کرلیں۔ (۱) عام حق رائے دہندگی۔ (۲) اچھوتوں کی نمائندگی علیحدہ
نہ ہو۔ (۳) کانگریس کا مکمل آزادی کا مطالبہ۔ مہاتما جی نے کانگریس کے
سامنے یہ معاملہ پیش کرنے سے انکار کر دیا اور ہندوؤں اور سکھوں کو
راضی کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۸ اکتوبر کو دو مشہور ہندو رہنماؤں
نے یہ تجویز پیش کی کہ سارا معاملہ ثالثوں کے بورڈ کے سپرد کر دیا جائے۔
لیکن ہندو اور سکھ رہنماؤں نے اسے بھی قبول نہ کیا۔ آٹھ تاریخ کو اقلیت
کمیٹی تیسری بار پھر ملی۔ اس مجلس میں مہاتما گاندھی نے فرقہ دارانہ مفاہمت
کی ناکامی کا ذمہ دار برٹش گورنمنٹ کو قرار دیا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک
گورنمنٹ نے برٹش انڈین ڈیلی گیشن کے لئے ان لوگوں کو منتخب کیا
تھا، جو صحیح معنوں میں نمائندگی نہ کر سکتے تھے۔ مسلم نمائندوں کی طرف
سے سر شفیع مرحوم نے مہاتما جی کی اس بلاوجہ تنقید پر اعتراض کیا۔ اور
ان کی تجاویز کی مخالفت کی۔ مجلس ختم ہوئی اور برٹش انتخاب عام کی وجہ
سے بارہ نومبر تک کوئی نشست نہ ہو سکی۔ اس دوران میں پندرہ اکتوبر
سے غیر رسمی بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان گفتگوؤں کا
ایک نمایاں عنصر سر جیفری کاربٹ کی اسکیم متعلقہ پنجاب تھی۔ یہ اسکیم [illegible]
آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں تجاویز سے کافی مشابہ تھی۔ اس کا
ماحصل یہ تھا کہ انبالہ کو پنجاب سے علیحدہ کر کے باقی حصہ میں مخلوط انتخابات
رائج کئے جائیں۔ لیکن ہندو اور سکھ رہنماؤں نے اسے بھی رد کر دیا۔
جو باوجود مخلوط انتخابات کے پنجاب میں مسلم اکثریت کو برداشت نہ کر

سکتے تھے۔ ان گفتگوؤں کی ناکامی پر اقلیتوں کے نمائندوں نے جو قریباً نصف ہند پر حاوی ہیں۔ آپس میں اقلیتوں کے باہمی معاہدہ کے امکان کے متعلق مشورہ کرنا شروع کیا۔ ۱۲ر نومبر کو سکھوں کے ماسوٰی تمام اقلیتوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے۔ جو اقلیت کمیٹی کے آخری اجلاس منعقدہ ۱۳ر نومبر کے موقعہ پر برطانوی وزیر اعظم کو دے دیا گیا۔

غیر رسمی گفتگوؤں کا یہ مختصر سا خاکہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے نمائندوں نے فرقہ دارانہ مصالحت کے لئے پوری کوشش کی۔ البتہ میرے لئے صرف ایک چیز راز رہی اور شاید ہمیشہ راز رہے۔ وہ ۲۶ر نومبر کو فیڈرل تشکیل کمیٹی (Federal structure Committee) میں ہمارے نمائندوں کا اعلان ہے، جب انہوں نے یک وقت خود اختیاری صوبجاتی حکومت اور مرکزیّت کو قبول کیا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مصالحت اور ملک کی عام سیاسی ترقی کے لئے مضطرب تھے یا ان کے دماغوں پر باہم مخالف اثرات کارفرما تھے۔ ۱۵ر نومبر کو، یعنی جس روز میں نے ڈیلی گیشن سے علیحدگی اختیار کی، مسلمان نمائندوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فیڈرل تشکیل کمیٹی کے مباحث میں شرکت نہیں کریں گے۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے فیصلہ کے خلاف حصہ کیوں لیا۔ البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان اس اعلان کو نہایت مہلک غلطی سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ کانفرنس اس اہم معاملہ میں اپنے خیالات کا اظہار پر زور طریقے سے کرے گی۔ آل

انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں میں نے آل انڈیا فیڈریشن (وفاقیت) کے
خلاف آواز بلند کی تھی۔ بعد کے واقعات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ ملک
کی سیاسی ترقی کے لئے سنگ راہ ہے۔ اگر مرکزیت کے اجزاء کا انحصار
کل ہند وفاق پر ہے جس کے لئے میری رائے میں کافی عرصہ درکار ہوگا۔
تو حکومت کو برطانوی صوبجات میں ذمہ دارانہ گورنمنٹ کا فوراً التزام کرنا
چاہیئے۔ تاکہ یہ تیار شدہ بنیادیں مرکزیت کے آنے تک تجربہ کے بل پر
وفاقی عمارت کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ جدید فیڈرل اسٹیٹ کے حصول
میں ہمیں بہت کچھ ابتدائی کام کرنا ہوگا۔ میرا خیال ہے اور ڈیلی گیشن
سے قطع تعلق کرنے سے چند روز قبل مجھے اس کا شبہ بھی گذرا تھا کہ ہمارے
نمائندوں نے بعض انگریز سیاست دانوں کے مشورہ پر صوبجاتی ذمہ دارانہ
حکومت کو ٹھکراتے میں غلطی کی ہے۔ حال ہی میں لفٹننٹ کمانڈر کن فرڈی
نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اعتدال پسند لیڈروں نے
چند انگریز مدبّروں کا غلط مشورہ قبول کیا کہ صوبجاتی آزادی کی قسط کو رد
کر دیا۔ یہ عجیب امر ہے کہ مہاتما جی بھی بظاہر اس قسط پر غور کرنے کیلئے
آمادہ نظر آتے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفٹننٹ کمانڈر نے یہاں کن
اعتدال پسند رہنماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے؟ سر تیج بہادر سپرو نے صوبجاتی
خود مختاری کے متعلق جو رویّہ لندن میں اور اب "مجلس شوریٰ" (Consultative
Committee) میں اختیار کیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ صاف ظاہر ہے
کہ صاحب مقالہ کی مراد ہندو لیڈروں سے نہیں ہو سکتی۔ میرا قیاس

ہے کہ اسکی مراد مسلم ڈائریکٹ لیڈروں سے تھی - جن کا فیڈرل تشکیل کمیٹی
میں ۲۶ ءار نومبر کا بیان برطانوی وزیر اعظم کے اعلان کا ذمہ دار ہے - جس
میں انہوں نے بروقت مرکزی اور صوبجاتی ذمہ داری کی خبر دی ہے -
اور حالانکہ صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے سلسلہ میں بنگال اور پنجاب
میں اکثریت کے لئے ہماری ملی مطالبات کا اعلان لازم تھا - لیکن موجودہ
صورت حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس مقام
پر برطانوی وزیر اعظم کی خاموشی (جس سے ملت اسلامیہ میں بہت سے
شبہات پھیل گئے ہیں) کی وجہ خود ہمارے رہنماؤں کا طرز عمل ہے -
برطانوی وزیر اعظم کے اس افسوسناک اعلان کے بعد دوسرا سوال جو
پیدا ہوتا ہے، وہ کسی نئی پالیسی کی تشکیل ہے - مسلمان قدرتی طور پر
فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے بارہ میں حکومت کے رویہ سے بدظن ہو گئے ہیں -
انہیں اندیشہ ہے کہ حکومت کانگریس سے ہر قیمت پر مفاہمت کے لئے
تیار ہے اور مسلمانوں کے مطالبات کی قبولیت کی تاخیر بھی اسی جماعت
سے گفت وشنید کی وجہ سے ہے - سیاسی امور میں حکومت پر اعتماد کرنے
کی پالیسی اب مسلمانوں کے دل سے نکلتی جا رہی ہے - جہاں تک عارضی
سمجھوتے کا تعلق ہے، تو ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسے فرقہ وارانہ سمجھوتہ پر
خواہ وہ عارضی ہو یا مستقل، رضامند نہیں ہو سکتے، جو انہیں ایسے صوبوں
میں جہاں وہ فی الواقعہ اکثریت میں ہیں، حق اکثریت نہیں دیتا - جداگانہ
حلقہ ہائے انتخاب کا قیام اور سرحدی صوبہ کی حیثیت تو اگرچہ متعین ہو

چکی ہے۔ لیکن مکمل صوبائی آزادی، پارلیمان سے ہندوستانی صوبوں کو
طاقت کا انتقال، تمام وفاقی حصّوں کی مساوات، موضوعات (سبجیکٹس)
کی تقسیم وفاقی اور صوبائی طریقہ پر، نہ کہ وفاقی، مرکزی اور صوبائی طریقہ
پر، سندھ کی غیر مشروط علیحدگی، مرکز میں ایک تہائی حصّہ کے حقوق، یہی
ہمارے مطالبات کی نہایت اہم شقیں ہیں۔ وزیر اعظم کی خاموشی کا نتیجہ
یہ نکلا ہے کہ ایک طرف کانگریس سے جنگ ہے اور دوسری طرف باقی ملک
سے بھی مصالحت نہیں۔ پھر کیا ہمیں کانگریس کی موجودہ جدوجہد میں شرکت
کرنی چاہیئے؟ میں بغیر کسی تامل کے کہتا ہوں۔ "ہرگز نہیں" اس تحریک
کے بنیادی محرکات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

میرے نزدیک اس تحریک کی بنا خوف اور غصّہ پر ہے۔ کانگریسی
لیڈر تمام ہندوستان کا واحد نمائندہ ہونے کے مدعی ہیں۔ لیکن آخری گول میز
کانفرنس نے ثابت کر دیا کہ صورتِ حال بالکل برعکس ہے۔ قدرتی طور پر یہ
احساس ان کے لئے خوش آئند نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ برطانوی حکومت
اور بیرونی ممالک اب فرقہ وارانہ سمجھوتہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی
جانتے ہیں کہ اقلیتوں کے مابین معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور برطانوی حکومت
اپنا ہنگامی فیصلہ نافذ کرنے پر تیار ہے۔ اگر ہندوستان کی مختلف جماعتیں کسی
فیصلہ پر یکجا نہ ہو سکیں۔ کانگریسی لیڈروں کو ڈر ہے کہ برطانوی حکومت
اپنا فیصلہ کرتے وقت کہیں اقلیتوں کے مطالبات نہ مان لے۔ اور اسی
لئے انہوں نے موجودہ تحریک کو جاری کر دیا ہے۔ تاکہ ایک نئے بنیادی مطالبہ

کو قوت دیں۔ اور اس طرح اُس معاہدہ کو ناکام کر دیں۔ جو شاید آئندہ دستور میں جگہ پا جائے اور حکومت کو مجبور کر سکیں کہ وہ اقلیتوں کا معاملہ کانگریس کے ساتھ طے کرے۔ کانگریس نے جس قرارداد کی بنا پر موجودہ جدوجہد شروع کی ہے، اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ چونکہ حکومت نے مہاتما گاندھی کو ملک کا واحد نمائندہ تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے کانگریس نے جدوجہد جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پھر کوئی اقلیت ایسی تحریک میں کیسے شامل ہو سکتی ہے، جو جس قدر حکومت کے خلاف ہے، اتنی اس کے خلاف بھی ہے۔

ان حالات میں کانگریس کی موجودہ جدوجہد میں شمولیت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ کو نہایت اہم فیصلے کرنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ملت کی موجودہ ذہنی کیفیت سے کما حقہ واقف ہوں گے۔ ہندوستان کے مسلمان حکومت کے طریق کار سے بدظن ہو چکے ہیں۔ ایک طرف اسے ہمارے جائز مطالبات قبول کرنے میں تامل ہے اور دوسری طرف اس کا ہمارے سرحدی بھائیوں سے دستوری اصلاحات کے آغاز کے موقعہ پر سلوک ہے۔ اور بہت سے لوگ اب یہ سوچنے لگے ہیں کہ کیا ایک تیسری جماعت کی قوت مسلمان اقلیت کو سیاسی مخالف اور اقتصادی طور پر غالب اکثریت سے بچانے کی ضامن ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی ایک گہری وجہ اور بھی ہے۔ واقعات کی تیز رفتاری اور سیاسی دنیا کے فوری تغیرات ایک شہنشاہی جمہوریت خصوصاً ایک پارٹی

گورنمنٹ کو اس کی مہلت نہیں دینے کہ وہ کسی متعین راہ عمل پر زیادہ عرصہ تک رہ سکے۔ موجودہ زمانہ کے مدبروں میں قوت تخیلہ کی کمی کی بجائے عیب کے صفت بن چکی ہے، اور اس عدم فکر کی بدولت بلند سیاسی سطح پر نہ دوام اور تغیر میں امتزاج قائم ہو سکتا ہے، نہ موجودہ سیاست کی بنیادیں گہری ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان ایسے غلام ملک میں حکومت سے تعاون کرنے والی جماعتیں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ سیاسی رویہ میں اُن کا استقلال برطانیہ کی کسی ایک یا دوسری پارٹی کی نظر میں کیا وقعت رکھتا ہے، جو کسی وقت برسر طاقت آجائے۔ انگلستان کی سیاسی جماعتوں کا مزاج اور اُن کے مقاصد کچھ ہی ہوں۔ آپ کو اپنی پالیسی کی بنا ایسے احسن ذاتی نتائج پر رکھنی چاہیئے، جس میں تمام برطانوی قوم کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہو۔ ایسی جنگ میں شمولیت سراسر حماقت ہوگی۔ جہاں مال غنیمت ان لوگوں کے ہاتھ آئے، جو یا تو آپ کے بداندیش ہوں، یا پھر آپ نے جائز سیاسی حوصلوں سے کوئی ہمدردی نہ رکھتے ہوں۔ اب حالات یہ ہیں کہ جماعت کی فوری مشکلات کا حل سوچتے ہوئے آپ کا فرض ہے کہ ایسے نتائج پیدا نہ ہونے پائیں، جن کے متعلق میں نے ابھی ابھی تشویش ظاہر کی ہے۔ بلکہ آپ کی تجویز کردہ راہ عمل کا فائدہ بالآخر آپ کی جماعت کو ہی پہنچے۔

میں معاملہ کو پوری وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا عارضی فیصلہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس شرط پر کہ گول میز کانفرنس کے نمائندوں کی واپسی کے بعد ہندوستان کی

جماعتیں آپس میں کسی سمجھوتہ پر نہ پہنچ سکیں۔ یہ اعلان برطانیہ کے دعویٰ
اور پالیسی کے عین مطابق تھا۔ کہ اس کی حیثیت بے لاگ پارٹی کی ہے۔ جو
ہندوستان کی باہم متحارب جماعتوں کے درمیان توازن قائم رکھتی ہو۔ لیکن
برطانوی حکومت کے موجودہ رویہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مقصد
توازن قائم کرنا نہیں بلکہ وہ بالواسطہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں یعنی
ہندو اور مسلمان کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ہم نے اکثریت والی
جماعت کو آزمایا۔ لیکن اُس نے ان تحفظات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، جن
کے بغیر کوئی قوم آزادی سے زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ دوسرا چارہ کار یہ
تھا کہ برطانیہ سے انصاف کی توقع کی جاتی، خصوصاً اس لئے بھی کہ مسلمانوں
سے ملک چھین کر انگریز نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ وہ ہندوستان میں غیر
جانبداری سے توازن قائم رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ
انگریز کا وہ پہلا حوصلہ اور کھرا پن جاتا رہا۔ اور اس کی جگہ ہر دم بدلنے والی
پالیسی نے لے لی ہے۔ جس سے اعتماد تو قائم نہیں ہو سکتا لیکن خود اُن
کی پوزیشن کو تقویت پہنچتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ سوال
پیدا ہو گیا ہے کہ انہیں موجودہ پالیسی پر کب تک عمل کرنا ہو گا، جس سے
اگرچہ انگریزوں کی مشکلات کا تدارک تو ہوتا ہے۔ مگر جماعت کو کچھ فائدہ
نہیں پہنچتا۔ اور یہ سوال کانفرنس کے فیصلہ کا منتظر ہے۔ میں فی الحال
صرف اتنا عرض کروں گا کہ اگر آپ کا فیصلہ موجودہ حکمت عملی کو خیرباد کہنے
کا ہو، تو آپ کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ پوری جماعت کو ایثار کے لئے

طیار کریں۔ جس کے بغیر کوئی غیرت مند قوم باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے نازک وقت آن پہنچا ہے۔ اپنا فرض بجا لائیے یا اپنے وجود کو مٹا دیجیئے۔

حضرات!

اب میں آپ کی توجہ دو نہایت اہم معاملات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میرا اشارہ سرحدی صوبہ اور کشمیر کی طرف ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی خیالات آپ کے ذہن میں بھی گھوم رہے ہوں گے۔

یہ کسی قدر مسرت کا مقام ہے کہ حکومت نے کم از کم سرحدی صوبہ کی سیاسی حیثیت کے متعلق ہمارے مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ اس حیثیت کا صحیح اندازہ صوبہ کے واقعی نظم و نسق سے لگ سکے گا۔ خیر یہ تو ابھی سے معلوم ہوتا ہے کہ حق رائے دہندگی کے معاملہ میں یہاں حکومت کا رویہ باقی صوبوں کی نسبت زیادہ فیاض رہا ہے۔ اصلاحات کا کام پورے زور شور سے اگلے مہینے سے شروع ہو جائے گا۔ لیکن جس اقدام نے تمام معاملہ کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، وہ حکومت کا جبر و تشدد ہے۔ جو سانحہ کے مابعد جاری ہے اور جو کسی طرح بھی مارشل لا سے مختلف نہیں۔ آئینی مسئلہ میں حکومت نے جس قدر انصاف سے کام لیا۔ اسے نظم و نسق کی سختی اور کم اندیشی نے بالکل بے اثر کر دیا ہے۔ ممکن ہے حکومت کے پاس انتہا پسند طبقہ کے خلاف معقول وجوہ ہوں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی عام جبر و تشدد کی پالیسی کے لئے صفائی پیش نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے

باقی حصّوں میں حکومت نے کافی حد تک ضبط سے کام لیا۔ لیکن سرحدی
صوبہ میں اس کے ظلم نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے۔ جو کسی مہذب
حکومت کے شایاں نہیں۔ زبانی خبریں اگر صحیح ہیں، تو میں سمجھتا ہوں
کہ سرحد کے انگریز حکام کے قلوب کو صوبجاتی دستور بندی سے کہیں زیادہ
اصلاح کی ضرورت ہے۔ تعذیب اور گرفتاریوں کی کوئی قطعی اور آخری
اطلاع نہیں ہے۔ لیکن اخباروں کے اندازے سے پتہ چلتا ہے کہ
ہزاروں کو گرفتار کر کے جیل میں بھیجا جا چکا ہے۔ یہ امر حکومت کے لئے
قابل توجہ ہے کہ رعایت اور ظلم کی بیہودہ مرکب پالیسی افغان ایسی غیور
قوم کو کہاں تک ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرحد کے نوجوانوں
پر عبدالغفار خاں کا بہت اثر ہے۔ لیکن جبر کے اقدام نے اس کے رسوخ
کو گاؤں کے جاہل لوگوں تک بھی پہنچا دیا ہے۔ یقیناً حکومت اس واقعہ
سے بے خبر نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پالیسی یہی تھی کہ سرحدی
مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ غیر مشروط سمجھوتہ کرنے سے باز رکھیں۔
ممکن ہے حکومت کے زاویۂ نظر سے مشکلات ہوں۔ لیکن میری ذاتی رائے
یہ ہے کہ اگر حالات پر دوسرے طریقے سے قابو ڈالا جاتا تو نوبت یہاں
تک نہ پہنچتی۔ حکومت نے سرحد میں اس وقت حالات کو بگڑنے دیا،
جب اس کی عام پالیسی رواداری کی تھی۔ جتنی جلدی حکومت تشدد سے
کام لینا بند کر دے گی۔ اتنا ہی خود حکومت اور صوبہ کے لئے بہتر ہوگا۔
موجودہ حالات نے تمام ہندی مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑا

دی ہے ۔ اور حکومت کے لئے یہ ہرگز دُور اندیشی نہیں کہ وہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے احساسات کا لحاظ نہ رکھے ۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ۔ مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رُونما ہُوئے ہیں ۔ ایسی قوم کا دفعۃً جاگ اُٹھنا جس میں شعلہ خودی بجھ چکا ہو، غم اور مصائب کے باوجود اُن لوگوں کے لئے مسرت کی بات ہے جو ایشیائی قوموں کی اندرونی کشمکش سے واقف ہیں ۔ کشمیر کی تحریک انصاف پر مبنی ہے ۔ اور مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایک ذہین اور صناع قوم میں اپنی شخصیت کا احساس نہ محض ریاست بلکہ تمام ہندوستان کے لئے طاقت کا باعث ہوگا ۔ البتہ جس چیز کا سب سے زیادہ رنج ہے، وہ ہندوستان کی فرقہ دارانہ مخاصمت ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنے کشمیری بھائیوں سے نظری ہمدردی کا ردِ عمل یہ ہُوا کہ ہندوؤں نے ایک ظالم نظام کے دفاع کی کوشش کی ۔ اور سارا الزام پان اسلامی سازش اور کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے برطانوی منصوبوں کے سر پہ دھر دیا ۔ اس تحریک کے فرقہ دارانہ رنگ کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے ۔ یعنی جبر و تشدد کا قیام اور بدنظمی ۔ اخباروں کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جموں ریاست میں حکومت بالکل بے بس ہے اور جتنا کچھ بھی ہے، برطانوی افواج کی موجودگی کی وجہ سے ہے ۔ ریاستی حکام کی شرمناک سفاکی اور استبداد کی زبانی خبریں بدستور آ رہی ہیں ۔ ایسے حالات میں

کمیشن معلومات بٹھانا بھی فضول ہے ۔ گلانسی رپورٹ نے اگرچہ اہم
واقعات کو تسلیم کر لیا ہے لیکن چونکہ وہ ان واقعات سے صحیح اور جائز نتائج
اخذ نہ کر سکی مسلمانوں کو اطمینان دلانے میں ناکام رہی ۔ واقعہ یہ ہے
کہ اب معاملہ ان مراحل سے بہت آگے بڑھ چکا ہے ۔ جہاں معلومات
کچھ مدد دے سکتی ہیں ۔ تمام دنیا کی قوموں میں احساس خودداری پیدا
ہو رہا ہے ۔ اور اس احساس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ حکومت میں زیادہ
حصہ طلب کریں ۔ ایک غیر متمدن قوم کے لئے سیاسی سرپرستی شاید
موزوں ہو ۔ لیکن یہ چیز خود حکومت کے مفاد میں داخل ہے کہ جب
لوگ نظریہ کی تبدیلی کا مطالبہ کرے تو وہ بنیادی تبدیلیوں سے کبھی نہ گھبرائے ۔
علاوہ اور باتوں کے جو کشمیر کے غیر معمولی حالات میں رونما ہوتی ہیں ۔
وہاں کے لوگوں کا مجلس عام (Popular Assembly) کا مطالبہ ہے ۔
ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ مہاراجہ صاحب اور حکومت ہند لوگوں کے
مطالبات کو ہمدردی سے دیکھیں گے اور مجھے یقین ہے کہ نیا وزیر اعظم
اپنی مخصوص برطانوی نظمی استعداد سے معاملہ کی تہ تک پہنچ جائے گا ۔
اور ایک قابل لیکن مظلوم قوم کو ابھرنے کا موقعہ دے گا ۔ جس نے زمانہ
قدیم کو چند بہترین دماغ عطا کئے ۔ اور مغلیہ تمدن کو اپنا رنگ بخشا ۔
دستوری اصلاحات کی راہ میں باقی ملک کی طرح کشمیر میں بھی رکاوٹیں
ہوں گی ۔ لیکن امن اور نظم کی بہتری اسی میں ہے کہ ان مشکلات پر
قابو حاصل کیا جائے ۔ اگر اس موجودہ اضطراب کا صحیح مطلب نہ سمجھا گیا

اور اس کی وجوہات ایسی جگہ تلاش کی گئیں، جہاں وہ نہیں مل سکتیں۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ کشمیر حکومت معاملہ کو اور زیادہ الجھا دے گی۔

چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے مطالبات کے متعلق برطانوی حکومت کا رویہ اور سرحدی صوبہ اور کشمیر کے تشویشناک حالات ہماری فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ لیکن معاملہ ان باتوں پر ختم نہیں ہو جاتا، جن کیلئے فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ان محرکات کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے۔ جو مستقبل کو خاموشی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ اور قوم کے سامنے پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں ایک مستقل لائحہ عمل رکھنا چاہئے۔ ہندوستان کی موجودہ تحریک کو مغربیت کے خلاف بغاوت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ مغربیت کے خلاف بغاوت نہیں ہے کیونکہ ہندوستانی مغربی اداروں کا ہی اپنے ملک کے لئے مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ کاشتکاروں کے ملک کو جو موجودہ جمہوریتوں کی اقتصادیات (money economy) سے محض نابلد ہو۔ انتخابات، پارٹی لیڈر اور پارلیمان کی خالی شان و شکوہ راست آئیں گے یا نہیں۔ تعلیم یافتہ شہری حصہ جمہوریت کا طلبگار ہے۔ اقلیتیں، جو اپنے تمدنی وجود کا احساس رکھتی ہیں، اور جن کی بقا خطرہ میں ہے، تحفظات چاہتی ہیں۔ جسے اکثریت تسلیم نہیں کرتی۔ اکثریت قومیت میں یقین رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ جسے اگر مغربی حالات سے دیکھا جائے، تو نظری طور پر صحیح ہے۔ لیکن اگر ہندوستان کے حالات سے دیکھا جائے تو عملی طور پر غلط ہے۔ پس موجودہ

جدّوجہد انگلستان اور ہندوستان کے مابین نہیں ہے۔ بلکہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان ہے۔ اقلیتیں مغربی جمہوریت کو قبول نہیں کر سکتیں جب تک کہ اس میں ہندوستان کے حالات کے مطابق ترمیم نہ کی جائے۔

مہاتما گاندھی کے طریقے بھی کسی ذہنی بغاوت کا پتہ نہیں دیتے۔ یہ طریقے دو مختلف قسم کے آفاقی شعور سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مغربی، دوسرا مشرقی۔ مغرب کے لوگوں کی ذہنی افتاد تاریخی ہے۔ ان کی زندگی اور اُن کا وجود وقت میں پوشیدہ ہے۔ مشرقی لوگوں کا آفاقی شعور غیر تاریخی ہے۔ مغربی آدمی کے لئے ہر چیز کا ماضی، حال اور مستقبل ہوتا ہے۔ مشرقی آدمی کے لئے اُن کا وجود بلا قید زماں قائم ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام، جو وقت میں نشانِ حقیقت دیکھتا ہے، ایشیا کی غیر مبدّل تصویروں میں خلل انداز ہوتا نظر آتا ہے۔ برطانیہ ہندوستان میں سیاسی اصلاح کو تدریجی ارتقاء کا عمل سمجھتا ہے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے نزدیک یہ غلبہ اور طاقت کو ہاتھ سے نہ دینے کے لئے بہانہ ہے۔ اور اس کے فوری حصول کے لئے ہر قسم کے تخریبی ابطال کو جائز رکھتا ہے۔ دونوں اساسی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس کا ظاہر نتیجہ بغاوت کی صورت ہے۔

لیکن یہ تمام مظاہر ایک آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ ایسا طوفان جو تمام ہندوستان اور ایشیا پر چھا جائے گا۔ یہ ایک سیاسی تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو ایک قابلِ استفادہ شے قرار دیتی ہے، نہ کہ ایک شخصیت، جس کے عروج اور نشوونما میں تمدنی قوتیں ممد

ہوا۔ ایشیائی قومیں لازماً اس استبدادی اقتصادیات کے خلاف بغاوت
کریں گی۔ جو مغرب نے مشرق پر جاری کر دی ہے۔ ایشیا اپنی انفرادیت
کے ساتھ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھ نہیں سکتا۔ تم جو اندر ہی اعتقاد
رکھتے ہو، وہ فرد کی اہمیت کا قائل ہے اور اس چیز کے لئے ساعی ہے کہ تم
خدا اور انسان کی خدمت کر سکو۔ اس کے امکانات ابھی پوری طرح دیکھنے
میں نہیں آئے ہیں۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جہاں ذات
رنگ یا دولت کے پیمانہ سے اس کی عظمت کو ناپا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کی
طرز زندگی سے۔ جہاں غریب امیروں پر ٹیکس عاید کرتے ہوں۔ جہاں انسانی
سوسائٹی شکم کی مساوات پر نہیں، بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔ جہاں
ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی کو عقد میں لا سکتا ہو۔ جہاں ذاتی ملکیت ایک
امانت ہو۔ جہاں اس طور پر اکتناز دولت کا امکان نہ ہو کہ وہ دولت پیدا
کرنے والے پر ہی چھا جائے۔ لیکن تمہارے عقیدہ کا یہ معراج نشاۃ وسطی
کے فقیہوں کی نازک خیالیوں سے پاک ہو جانا چاہیئے۔ روحانی طور پر ہم ان
تخیلات اور احساسات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو ہم نے پچھلی صدیوں
کے دوران میں اپنے گرد لپیٹ لی ہیں۔ اور یہ ہم بڈھوں کے لئے باعث شرم
ہے کہ ہم نے نئی پود کو ان اقتصادی، سیاسی اور مذہبی انقلابات کے لئے
تیار نہیں کیا۔ جو موجودہ دور میں انہیں پیش آئیں گے۔ تمام ملت کو اپنی
ذہنیت درست کرنے کی حاجت ہے۔ تاکہ تازہ امیدوں اور مقاصد کا
احساس پیدا ہو سکے۔ ایک مدت دراز سے ہندی مسلمانوں نے اپنی اندرونی
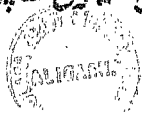
کیفیات کی گہرائیوں کو ٹٹولنا چھوڑ رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ
زندگی کی پوری تابندگی اور آب و تاب کو دیکھ نہیں پاتا، اور اسی لئے یہ
اندیشہ ہے کہ وہ ان قوتوں کے ساتھ کسی بزدلانہ صلح پہ تیار ہو جائے گا۔ جو
اس کے نزدیک ناقابل عبور ہیں۔ جو کوئی غیر موزوں ماحول کو تبدیل کرنا
چاہتا ہے۔ سب سے پہلے اسے اپنے اندر مکمل تبدیلی کرنی ہوگی۔ خدا کسی قوم کی
حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنا نصب العین متعین کر کے خود اپنی حالت
کو نہیں بدلتی۔ کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کو خود اپنی قلبی زندگی
کی آزادی پر یقین ہو۔ یہی یقین تو ہے، جو قوم کی نظر اپنے مقصد سے ہٹنے
نہیں دیتا۔ اور اسے تذبذب سے نجات دلاتا ہے۔ جو سبق ہمیں پرانے تجربہ
سے ملا ہے، وہ بھولنا نہیں چاہیئے۔ کسی طرف سے کسی قسم کی توقع نہ رکھو۔
خود اپنے پر نظر جماؤ، اپنی خاک کو انسانیت کی پختگی بخشو، اگر تم اپنے ارادوں
میں کامیاب ہونا چاہتے ہو۔ مسولینی کا قول تھا۔ جو قوت رکھتا ہے، دولت
رکھتا ہے۔ میں کہوں گا۔ جو قوت مجسم ہے، اسے سب کچھ میسر ہے۔ سخت
بنو اور سختی جھیلو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی راز ہے۔ ہمارے نصب العین
کا تعین ہو چکا ہے۔ ہمیں آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایک ایسی جگہ فتح
کرنی ہے۔ جو آگے چل کر اس ملک میں اس کے مقاصد کی تکمیل میں مددگار
ثابت ہو۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقصد کی روشنی میں جماعت
کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے، اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑا
جائے۔ شعلۂ حیات مستعار نہیں لیا جاتا، اسے تو خود اپنی روح کے مندر میں

فروزاں کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے پیہم مستعدی کی ضرورت ہے اور ایک مستقل پروگرام کی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پروگرام کیا ہونا چاہئیے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ پروگرام قدرے سیاسی ہو اور قدرے تعارفی۔ اور اس ضمن میں میں کچھ تجاویز پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

اوّلاً: ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ ہمارے رہنماؤں کے سیاسی افکار میں ابھی تک خلفشار باقی ہے۔ لیکن اس کا ذمہ دار عوام کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عوام میں قربانی کے جذبہ کا فقدان نہیں ہے جبکہ ملک کی قسمت کا سوال پیدا ہو جائے اور پچھلے چند سالوں کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ قوم کی رہنمائی آزاد طریقے پر نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر بگاڑ کی صورت رونما ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ جماعتیں کوئی ضبط قائم نہ کر سکیں۔ جو سیاسی اداروں کی قوت اور بقا کے لئے سخت اہم ہے۔ اس خرابی کا ازالہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو جس کی شاخیں تمام صوبوں اور ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اس کا نام خواہ کچھ ہو لیکن اس کا اساسی دستور ایسا ہونا چاہئیے کہ ہر قسم کے سیاسی فکر کو ابھرنے کا موقعہ مل سکے جو جماعت کی اپنے شعور اور طریقوں سے رہنمائی کر سکے۔ میری رائے میں بدنظمی کو مٹانے اور ہماری منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

ثانیاً: اس مرکزی جماعت کو کم از کم پچاس لاکھ کا قومی فنڈ فوراً

جمع کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ ہم سخت وقتوں میں رہ رہے ہیں۔ لیکن میں یقین
دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اس آواز پر لبیک کہیں گے۔ بشرطیکہ
اُن پر موجودہ صورتِ حالات کی نزاکت واضح کرنے کی پوری سعی کی جائے۔

ثالثاً:۔ میرا مشورہ ہے کہ مرکزی جماعت کے اختیار اور رہنمائی میں
تمام ملک کے اندر نوجوان لیگیں اور والنٹیروں کے دستے قائم کیے جائیں۔
جو اپنی تمام تر توجہ خدمتِ خلق، رسومات اور قصبوں اور گاؤں میں اقتصادی
پروپیگنڈہ پر صرف کریں۔ ان چیزوں کی پنجاب کو خصوصاً سب سے زیادہ
ضرورت ہے۔ جہاں کا مسلمان زمیندار قرض کے بوجھ کے نیچے دبا پڑا رہتا ہے۔
اب حالات ۱۹۲۷ء کے چین کی طرح ناگوار صورت اختیار کر چکے ہیں۔ سائمن
رپورٹ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ کاشتکار اپنی آمد کا کثیر حصہ حکومت کو دے دیتا
ہے۔ اور حکومت اس کے عوض اُسے امن، اطمینان، ذرائع تجارت وغیرہ
بخشتی ہے۔ لیکن ان نعمتوں کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ ایک منظم ٹیکس، مشینی مال
کی وجہ سے دیہاتی اقتصادیات کی تباہی، اور اجناس کی تجارت، جس سے
کاشتکار ہمیشہ ساہوکار کا شکار بنا رہتا ہے۔ پنجاب میں یہ معاملہ نہایت
نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نوجوانوں کی جماعتیں
اس سلسلہ میں خوب پروپیگنڈا کریں۔ اور زمینداروں کو موجودہ پھندوں
سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں، ہندوستان میں
اسلام کے مستقبل کا انحصار پنجاب کے مسلمان کاشتکار کی آزادی پر ہے۔
پھر چاہیئے کہ آتشِ شباب سوزِ یقین کے ساتھ مل کر زندگی کی شعاع کو تیز

کرے اور آنے والی نسلوں کے لئے عمل کی نئی دُنیا تخلیق کرے۔ جماعت کسی مخصوص وقت پر آدمیوں اور عورتوں کی گنتی کا نام نہیں۔ بلکہ اس کی بقا اور میدانِ عمل کا تعلق اس لامحدودیت سے ہے، جو اس کی گہرائیوں میں خوابیدہ ہوتا ہے۔

رابعاً:۔ ہندوستان کے تمام بڑے قصبوں میں مردوں اور عورتوں کے تمدنی ادارے قائم کئے جائیں۔ لیکن ان اداروں کو سیاسی مسائل سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا اہم مقصد یہی ہو کہ وہ اگلی نسل کی خوابیدہ قوتوں کو مجتمع کریں۔ انہیں اسلام کی گزشتہ فتوحات یاد دلائیں۔ اور یہ بتلائیں کہ عالمِ انسانیت کی مذہبی اور تمدنی زندگی میں ابھی اسلام نے کیا کچھ کرنا ہے۔ عوام کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کہ ان کے سامنے کوئی نیا کام رکھا جائے۔ جو فرد کو پوری جماعت پر نظر ڈالنے اور سمجھنے کی توفیق بخشے۔ اور جب یہ قوتیں ایک بار بیدار ہو جائیں۔ تو وہ اپنے ساتھ نئی کشمکش کے لئے تازہ دم لاتی ہیں۔ اور ایک ایسی باطنی آزادی، جو نہ محض کشمکش کو پسند کرتی ہے۔ بلکہ حیاتِ نو کی خبر بھی دیتی ہے۔ ان جماعتوں کو ہمارے نئے اور پرانے تعلیمی اداروں سے گہرا رابطہ رکھنا ہوگا۔ تاکہ ہماری تعلیمی مساعی کو مختلف سمتوں سے سمیٹ کر ایک مرکز پر جمع کر سکیں۔ اور اس سلسلہ میں میں ایک عملی تجویز پیش کرتا ہوں۔ ہرٹاگ کمیٹی کی پہلی رپورٹ نے جو غالباً دوسرے سیاسی مسائل کے درمیان فراموش ہو چکی ہے، مندرجہ ذیل سفارش کی ہے۔ جسے میں ہندوستان

سے مسلمانوں کے لئے ازبس ضروری سمجھتا ہوں :-

"اس میں شک نہیں کہ اگر اُن صوبوں میں، جہاں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں مذہبی مشکلات حائل ہیں، مذہبی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جائے کہ جماعت اپنے بچے عام درسگاہوں میں بھیجنے کیلئے آمادہ ہو جائے۔ اس طریق سے نظام کو مالی فائدہ بھی ہوگا اور کارگزاری بھی بہتر ہوگی۔ اور یہ طریقہ جماعت کو تعلیمی پستی کے الزام سے بچانے میں کافی معاون ثابت ہوگا۔ ہم بخوبی واقف ہیں کہ ایسے انتظامات آسانی سے نہیں ہو سکتے۔ اور دوسرے ممالک میں ان سے کافی تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ عملی تجاویز کے لئے زبردست کوشش کی جائے۔"

پھر صفحہ ۲۰۶ پر تحفظات کے سلسلہ میں رپورٹ ہے :

"چنانچہ اگر قومی نظام کے اندر مخصوص انتظامات کئے جائیں، جو مسلمانوں کی جماعت کو حائل ہیں اور آئندہ کچھ عرصہ کے لئے ملک کی زندگی اور ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنا سکے۔ ہماری رائے میں یہ چیز صحیح جمہوری یا تعلیمی اصولوں کے منافی نہ ہوگی۔ ہماری خواہش ہے کہ تحفظات سرے سے نہ ہوں، اگر ہوں تو کم سے کم۔ کیونکہ ان سے تعلیمی نظام کے اندر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کو اُن کی موجودہ پستی کی حالت سے نکالنے اور انہیں موجودہ حالات سے بچانے کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اور ہمیں اس طریقہ کو قومی پالیسی کی وسعت کے پیش نظر مناسب سمجھنے میں کوئی جھجک نہیں۔"

مجوّزہ تمدّنی اداروں یا اُن کے قیام سے قبل آل انڈیا مُسلم کانفرنس کا فرض ہے کہ وہ ان تجاویز کو جو ہماری جماعت کی مشکلات پر مبنی ہیں ۔ عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرے ۔

خامساً : میں علمار کی جمعیّت کے قیام کا مشورہ دوں گا۔ جس میں وہ مسلمان وکلار بھی شامل ہوں ۔ جو موجُودہ فقہ سے واقف ہیں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت ، وسعت اور تجدید ہو۔ لیکن اس طور پر کہ بُنیادی اصُولوں کی رُوح قائم رہے ۔ اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو۔ تاکہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لار پر اثر انداز ہوتا ہو اس جماعت کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے ۔ اس تجویز کے محض عملی فائدہ کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے ۔ کہ زمانۂ حاضرا اور اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں ، کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں خصُوصًا سرمایہ دارانہ ذہنیّت کی دُنیا کے لئے ، جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں ، اس قسم کی اسمبلی کا قیام اس ملک میں اسلامی اصولوں کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا ۔

بجٹ ۲۸-۱۹۲۷ء پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو کی گئی

جناب عالی! میں بجٹ کے متعلق جو ۲۸ فروری کو کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا چند ایک عام باتیں عرض کروں گا۔ وہ شخص جس نے آنریبل فائننس ممبر[1] کی تقریر اور فائننس سیکرٹری[2] کی تیار کردہ یادداشت کو پڑھا ہے، ان کی غیر معمولی وضاحت بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہ حیثیت ایک عام آدمی کے میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے ان تحریروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ حقیقتاً فائننس سیکرٹری صاحب نے صاف گوئی اور وضاحت سے ان اعتراضات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو صوبے کی عام مالی حالت کے متعلق کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ پچھلے سال ہمارا خرچ آمدنی سے تئیس لاکھ زیادہ رہا ہے۔ نیز اس سال بھی ہم اپنی آمدنی سے ساٹھ لاکھ روپیہ زیادہ خرچ کریں گے۔ گویا دو سال کے عرصے میں ہم صوبے کی کل آمدنی سے تراسی لاکھ روپیہ زیادہ خرچ کریں گے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم "ترقیات" پر

---

[1] سر جیوفری ڈی مونٹمورنسی۔ [2] مسٹر ایچ، ڈبلیو، ایمرسن +

اتنی بڑی رقمیں خرچ کرنے میں حق بجانب بھی ہیں یا نہیں ؟ اگر ان تمام امور کو مدّنظر رکھیں جن کا فنانس سیکریٹری صاحب نے اپنی تقریر میں ذکر کیا ہے تو صوبے کی مجموعی مالی حالت تسلّی بخش معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ مستقل مالی ذرائع کی عدم موجودگی میں ٹیکسوں کو گھٹانا مناسب نہیں۔ تاہم جہاں تک ٹیکسوں میں کمی بیشی کا تعلّق ہے۔ میں ابھی اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ چونکہ صوبے کی مالی حالت تسلّی بخش ہے اس لئے بجٹ میں کوئی نہ کوئی شق دیہات کی صحت و صفائی اور عورتوں کے واسطے طبّی امداد کے متعلّق بھی ضرور ہونی چاہیئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس صوبے میں عورتوں کے واسطے طبی امداد بہم پہنچانے کی اشد ضرورت ہے لیکن بجٹ میں اس قسم کی کوئی شق معلوم نہیں ہوتی۔ لہذا میں جناب اور دیگر معزّز ممبران کی توجّہ اس اہم امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جہاں تک ٹیکسوں میں تخفیف کا تعلّق ہے میرا خیال ہے کہ جب فنانس سیکریٹری صاحب نے اپنی قابل تعریف تقریر تیار کی ہوگی تو ان کے پیش نظر گورنمنٹ آف انڈیا کی منظور کی ہوئی تخفیفات نہیں ہونگی۔ لیکن اب ہمیں معلوم ہے۔ کہ چھیاسی[۸۶] لاکھ کی تخفیف ہوگئی ہے (مسٹر رِیچ ڈی کریک : تخفیف کا امکان ہے) جن میں سے ساٹھ[۶۰] لاکھ متواتر الوقوع ہیں اور بیس[۲۰] لاکھ غیر متواتر الوقوع۔ اگر اس قدر بڑی رقم معاف کر دی جائے اور مجھے امید ہے کہ ایسا ضرور ہوگا، تو میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ ٹیکس کم کردیئے جاویں اور اس رقم کو اس بے قاعدگی اور بے ترتیبی کے دُور کرنے میں صرف کرنا چاہیئے جو ہمارے ٹیکس

سسٹم میں ہے۔ وہ بے قاعدگی اور بے ترتیبی یہ ہے کہ ہم انکم ٹیکس میں
میں تو تدریجی ترقی کے اصول کو استعمال کرتے ہیں لیکن لگان میں ایسا
نہیں کیا جاتا۔

تدریجی ترقی کے اصول کو لگان میں استعمال نہ کرنے کا جواب بعض
اوقات غیر متمدن نظریات میں یہ پایا جاتا ہے کہ زمین حکومت کی ہے لیکن
ملکیت کا کلی دعویٰ نہ تو قدیم ہندوستان میں کیا گیا اور نہ ہی شاہان مغلیہ
کے دور میں۔ یہ اس مبحث کا تاریخی پہلو ہے۔ ٹیکیشن انکوائری کمیٹی
نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے اگرچہ کمیٹی کے نصف ممبروں کا تو یہ
خیال تھا کہ مالیات اراضی ٹیکس نہیں کہلایا جا سکتا۔ اور باقی نصف اسے
ٹیکس ہی کی قسم خیال کرتے ہیں۔ تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ اس ملک میں
بادشاہوں نے اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے
کہ مغلوں کے زمانے میں یہ اصول رائج تھا۔ لیکن پنجاب کے لوگ اس صوبے
کی زمین پر خاندان مغلیہ کے یہاں آنے سے بہت پہلے سے قابض تھے جس
کا لابدی نتیجہ یہ ہے کہ بادشاہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور اس حیثیت
سے صرف اہل ملک ہی غیر فانی ہیں۔

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت ۔۔۔ خراجِ شہر و گنج کان و یم رفت
امم را از شہاں پائندہ تر داں ۔۔۔ نمے بینی کہ ایران ماند و جم رفت

لہٰذا میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی ملک میں یہ نظریہ رائج
بھی تھا تو بھی بیسویں صدی میں یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ رقم زیر

تخفیف آجائے تو ہمیں اسے ٹیکسوں کے کم کرنے میں صرف کرنا چاہیئے اور لگان میں تدریجی ترقی کے اصول کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اس وقت تمام زمینوں پر لگان دیا جاتا ہے، خواہ کوئی آدمی دو کنال زمین کا مالک ہو۔ خواہ دو سو کنال کا سب کو مالیہ دینا پڑتا ہے۔ انکم ٹیکس میں تدریجی یا ٹیکس ادا کرنے کی صلاحیت کا اصول عمل میں لایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک تو وہاں درجہ وار محصول بندی ہے دوسرے کچھ لوگ ٹیکس سے قطعی طور پر بری ہیں۔ لہذا میری گزارش ہے کہ کونسل کو ٹیکسوں میں تخفیف کے سوال پر اس اصول کے ماتحت سوچ بچار کرنا چاہیئے۔

گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کیلئے مطالبہ میں تخفیف کی تحریک پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۱۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو کیگئی

جناب عالی! تعلیم کا سوال بہت اہم ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ جن معزز ممبروں[۱] نے مجھ سے پہلے تقریریں کی ہیں انہوں نے اس موضوع پر کمال سرگرمی اور ولولے کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ تعلیم ایک مشترکہ دلچسپی کا معاملہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو، مسلمان، سکھ، سرمایہ دار اور مزدور سب کا اس معاملہ سے تعلق

---

[۱] پنڈت نانک چند اور چودھری افضل حق۔

ہے۔ لیکن انہوں نے اس مسئلہ پر ایک بدیشی حکومت کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا۔ ایک بے غرض بدیشی حکومت تناقض اصطلاحات ہے۔ اس ملک کی بدیشی حکومت لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ رکھنا چاہتی ہے۔ بدیشی حکومت رومن کیتھولک کلیسا کی ایک قسم ہے جو ان تمام ذرائع کو مسدود کرنا چاہتی ہے جس سے عوام میں روشن خیالی پیدا ہو سکے۔ جس آنریبل ممبر نے مجھ سے پہلے تقریر کی ہے انہوں نے پنجاب کی ۲۶-۱۹۲۵ء کی تعلیمی رپورٹ کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم تعلیم پر زر کثیر خرچ کرتے ہیں لیکن فائدہ مفقود ہے کیا اس ایوان میں یا اس ایوان سے باہر کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ عوام الناس کے لئے ہمیں تعلیم کی اشد ضرورت ہے؟ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور دستکاری سب عوام الناس کی تعلیم کے مختلف پہلو ہیں۔ اس ملک میں زمانۂ قدیم کے بزرگ دنیا کو مایا یا سراب کہا کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس ایوان سے باہر دنیا مایا ہے یا نہیں لیکن مجھے اس امر کا یقین کامل ہے کہ جو کچھ اس ایوان میں ہوتا ہے وہ سراب ہے۔ اگرچہ میں خود بھی اس سراب کا ایک ضروری جزو ہوں۔ اب ہم تعلیم کے ایک ایک درجے یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ کو لیتے ہیں۔ اس رپورٹ کی ہم جو بھی چاہیں توجیہہ کریں۔ لیکن اس سے ایک حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جبری تعلیم کا فوراً نفاذ کرنا چاہیئے۔" وزارت تعلیم کی کارروائی" کے صفحہ ۲ پر تحریر ہے:

" جیسا کہ ڈائرکٹر تعلیم کا خیال ہے جبری تعلیم مستقبل بعید ہی کا نصب العین

ا؎ پنڈت نانک چند

نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان رقوم کو جو وہ نیک تعلیم پر خرچ ہو رہی ہیں اس مفید مقصد پر خرچ کرنے کا موجودہ اور قابل عمل ذریعہ بھی بتایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا امید کی جاتی ہے۔ کہ مقامی حکام اور دوسرے اصحاب جبری تعلیم کے اصول کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے واسطے فوری اور موثر قدم اٹھائیں گے۔"

ساتھ ہی ساتھ ماہر تعلیمات مسٹر میہوتے، جنہیں ذاتی طور پر جاننے کا مجھے فخر حاصل ہے،۔ ہمیں بتایا ہے کہ جہاں تک رضا کارانہ طریقہ تعلیم کا تعلق ہے، موجودہ آثار یاس انگیز ہیں۔ جبری طریقہ تعلیم کے نفاذ کے حق میں یہ بھی ایک دلیل ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جبری تعلیم ۲۰۴ میونسپلٹیوں اور قریباً ۴۰۰، یا ۴۰۰ سے کچھ زیادہ، دیہات میں رائج ہے۔ ان مقامات پر کیا ہوتا ہے؟ ہمیں اس رپورٹ سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کبھی والدین پر اپنے بچوں کو مدرسہ نہ بھیجنے پر جرمانہ کیا گیا ہے یا نہیں۔ نہ ہی ہمیں ان اساتذہ کی تعداد معلوم ہے جو ان مدرسوں میں پڑھاتے ہیں۔ جب تک ہمیں کافی معلومات بہم نہ پہنچائی جائیں۔ ہم ان میونسپلٹیوں اور دیہات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جہاں تک مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے میں اس ایوان کے ممبروں کو بتا سکتا ہوں کہ ان مقامات پر روپیہ ضائع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ چند سکول جو بظاہر جبری معلوم ہوتے ہیں کھول دئیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سکول رضا کارانہ ابتدائی سکولوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں۔ جناب عالی میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سکول بالکل بے کار ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ جس

طریقہ پر یہ کام کرتے ہیں وہ جبری تعلیم کے اصول کے معیار تک پہنچتا ہی نہیں۔ رپورٹ خود حتمی طور پر ثابت کر دیتی ہے کہ جبری تعلیم کے اصول کے نفاذ کے بغیر چارہ نہیں۔ فی الواقعہ وہ روپیہ جو ہم ابتدائی تعلیم پر ضائع کر رہے ہیں پیش نظر رپورٹ کے مطابق جبری تعلیم کے طریق کو اختیار کرنے کی حمایت میں ایک دلیل ہے۔ رپورٹ میں مذکور ہے کہ لڑکوں کی ایک کثیر تعداد پہلی جماعت میں داخل ہوتی ہے لیکن وہ روپیہ جو ان پر خرچ کیا جاتا ہے اس لئے ضائع ہوتا ہے کہ یہ لڑکے اعلیٰ جماعتوں تک نہیں پہنچتے۔ اگر ان لڑکوں پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے تو یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کو اعلیٰ جماعتوں تک بھی لیجایا جائے۔ انہیں اعلیٰ جماعتوں میں پڑھنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ لہٰذا میں یہ گزارش کرتا ہوں کہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اس صوبے کی فلاح و بہبود کے پیش نظر جبری طریقہ تعلیم کا اختیار کرنا بحد ضروری ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات پر تحریک التواء کے سلسلہ میں تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۱۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو کی گئی۔

جناب عالی! جس مرض سے ہمیں سابقہ پڑا ہے وہ بہت پرانا ہے۔ اطبا کی ایک کثیر تعداد نے اس مرض کی تشخیص کرنے کی کوشش کی ہے،

ان میں سے بعض ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن بیشتر بالکل ناکام رہے ہیں۔ مختلف اطبا نے مرض کے مختلف علاج تجویز کئے ہیں۔ لیکن ایک شاعر کے الفاظ میں ؎

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

بہمہ تمام علاج اصل مقصد کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔ یعنی یہ اصحاب اُس برائی کے واسطے جو اس بدنصیب صوبے کے حصّہ میں آئی ہے کوئی تریاق نہیں ڈھونڈھ سکے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس بُرائی کی اصل وجہ زیادہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کی جدوجہد ہے۔ دوسرے اصحاب کے نزدیک اصل وجہ اس خیال سے بالکل مختلف ہے۔ پنڈت نانک چند کی تقریر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل بنی نوعِ انسان کی محبت سے لبریز ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مقدّس گفتگو اس تصوّر کے واسطے جو اُن کے دماغ پر مسلّط ہے محض ایک آڑ ہے۔ جو کچھ ہم اس سے قبل حاصل کر چکے ہیں اس سے اب ہم دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ تو محض "تمہارا مال سو ہمارا مال۔ ہمارا مال سو ہاں ہاں" والا معاملہ ہے!

بعض ممبروں کا خیال ہے کہ صوبے کی پست صحافت موجودہ حالات کی ذمّہ دار ہے۔ دوسرے ممبروں کی رائے میں اصل وجہ ملازمتوں اور آرا کے لئے جدوجہد ہے۔ تجاویز کی تو کمی نہیں لیکن اُن پر عمل کرنے کے لئے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا۔ لاہور میں فسادات کے فوراً بعد مختلف خیالات و افکار کے

نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور اس کمیٹی کا ایک اجلاس رائے بہادر موتی ساگر کے دولت کدہ پر منعقد بھی ہوا تھا۔ لیکن مجھے بیحد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اجلاس پہلا اور آخری اجلاس تھا۔ اس میں مَیں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ باہمی منافرت کو دُور کرنے کے لئے کمیٹی کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جن کا یہ فرض ہو کہ وہ شہر کے مختلف حصّوں میں جا کر لوگوں کے باہمی تنازعات کی خرابی واضح کریں۔ لیکن میری تجویز کا وُہی حشر ہوا جو عام طور پر اس قسم کی تجاویز کا ہوتا ہے۔ ہم نے بہت سے مقدس مباحثے کئے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اس ایوان میں باہمی رفاقت کے لئے دُھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں۔ مشترکہ کمیٹیاں اور مفاہمتی بورڈ بنانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ لیکن اسی ایوان کے ہر ممبر پر مَیں یہ امر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہُوں کہ لیت و لعل سے معاملات سُدھر نہیں سکتے۔ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں مزید تاخیر قطعاً نہ ہونی چاہیئے۔ مجھے معلوم نہیں اگر ممبروں کو اس امر کا احساس ہو چلا ہو کہ حقیقتاً ہم ایک خانہ جنگی کے دَور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اگر اس خانہ جنگی کو دبانے کے لئے سخت تجاویز عمل میں نہ لائی گئیں تو تمام صوبہ کی فضا مسموم ہو جائے گی۔

مَیں چودھری ظفر اللہ خاں کی تہ دل سے تائید کرتا ہوں کہ جلد از جلد ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کرنا چاہیئے جس میں گورنمنٹ کو بھی شرکت کی دعوت

دی جائے۔ اس کانفرنس کو موجودہ حالات کا بغور مطالعہ کرنا چاہئیے اور اس قسم کی تجاویز پیش کرنی چاہئیں جو موجودہ کھچاوٹ کو دور کر سکیں۔ اگر یہ فرقہ وارانہ منافرت ملک کے دوسرے حصوں پر بھی اثر انداز ہوئی اور گاؤں میں رہنے والوں نے بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹنا شروع کر دیا تو پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہو۔

ملازمتوں کو مقابلہ کے امتحان سے پُر کرنے سے متعلقہ ریزولیوشن پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۱۹ جولائی ۱۹۲۷ء کو کی گئی۔

جناب عالی! آنریبل وزیر مال[1] کی تقریر کے بعد جو موجودہ صورت میں ریزولیوشن[2] کا میرے خیال کے مطابق منہ توڑ جواب ہے اس ایوان میں کسی کے لئے اس مباحثے میں کوئی خوشگوار اضافہ کرنے کا امکان نہیں۔

---

[1] سر جیفری ڈی مونٹمورنسی۔

[2] اس قرارداد کے جو سردار اجل سنگھ نے پیش کی تھی الفاظ یہ ہیں:-

"یہ کونسل گورنمنٹ سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ تمام محکموں میں سرکاری ملازمتوں کو جہاں تک ممکن ہو مقابلہ کے امتحان سے پُر کیا جائے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو اور انتخاب ضروری سمجھا جائے تو سب سے زیادہ مستند امیدوار کو بلا لحاظ قوم، مذہب اور رنگ منتخب کیا جائے۔"

تاہم میں سردار اجل سنگھ کی معصومانہ تصوریت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو تمام دوسری تصوریتوں کی طرح واقعات کے علاوہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ میں اپنے محترم دوست کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مقابلہ کے امتحان کا اصول بذاتِ خود اس ملک میں بالعموم اور اس صوبے میں بالخصوص ناقابلِ عمل ہے میرا خیال ہے کہ اس ایوان میں بہت سے محترم ممبروں کو اس واقعہ کا علم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ایسا غیر فرقہ دارانہ ادارہ بھی اپنے مختلف امتحانات میں فرضی رول نمبروں کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح ممتحن کو اس امیدوار کے جس کا وہ پرچہ دیکھتا ہے، مذہب، ملت، رنگ اور کالج کے متعلق کچھ پتا نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ خطرہ تھا کہ ہندو ممتحن مسلمان امیدواروں کو فیل نہ کر دیں اور مسلم ممتحن ہندو امیدواروں کو (آوازیں شرم شرم)، یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک شرمناک فعل ہے لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ہندو اور مسلمان امیدوار اپنے پرچوں میں بعض ایسے نشانات چھوڑ دیتے ہیں جن سے ممتحن کو اس کے مذہب اور ملت کا پتہ لگ جائے۔ کل ہی کی بات ہے کہ میں ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کے پرچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے چند پرچوں پر "۷۸۶" لکھا ہوا دیکھا جو عربی کے ایک فارمولے کے ہندسوں کا مجموعہ ہے، اسی طرح دوسرے پرچوں پر "اوم" لکھا ہوا تھا جس سے مراد ایک طرف تو خدا سے امداد مانگنا ہے اور دوسری طرف ممتحن پر امیدوار کی ملت کا ظاہر کرنا۔ ایک غیر فرقہ دارانہ ادارے میں تو صورتِ حالات یہ ہے۔ اب ایک اور مثال لیجئے۔ تازہ فسادات لاہور میں ہندو اور مسلمان دونوں وفود بنا کر کئی دفعہ

ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے اور ہر دو وفود نے مخالف ملّت کے تحقیقاتی افسروں کے خلاف شکایت کی۔ اس قسم کے ایک وفد کا میں بھی ممبر تھا (آوازیں۔ شرم شرم) یہ کوئی شرم کی بات نہیں۔ ہمیں واقعات کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنا ہے یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ صورت حالات اس قدر نازک ہو چکی ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمیں جو جواب دیا وہ آپ کو معلوم ہے اور میرے خیال میں اس نے جو کچھ کہا اس میں وہ بالکل حق بجانب تھا "اصلاحات کی سکیم کے نفاذ سے پہلے پولیس میں ۱۲۰ برٹش افسر تھے اور اب صرف ۶۸۔ ہمارے برٹش افسروں کی تعداد کافی نہیں ہے اور دونوں فرقے یورپین افسر چاہتے ہیں"۔

بد قسمتی سے میرے دوست پنڈت نانک چند اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے رنگ و نسل کا امتیاز اڑا دیا ہے اور اس طرح وہ آسامیاں جو پہلے برٹش افسروں کو ملتی تھیں اب ہندو اور مسلمانوں کے حصہ میں آتی ہیں لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بڑی سخت غلطی کی ہے اور اگر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا (آوازیں۔ نہیں، نہیں) جب میں یہ کہتا ہوں تو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر کے کہتا ہوں اور میں "نہیں نہیں" کی آواز کا مطلب بھی خوب سمجھتا ہوں۔ میں اس غلط اور سطحی قومیت سے مسحور نہیں ہوں جس کا اظہار اس طریق پر کیا جائے (ڈاکٹر شیخ محمد عالم۔ ہر شخص ایسا نہیں ہے) ممکن ہے ایسا ہو لیکن متحدہ

قومیت کی گفتگو بیکار رہے اور بہت عرصہ تک بیکار ہی رہے گی۔ یہ لفظ پچھلے پچاس سال سے زبان زد عام رہا ہے لیکن جس طرح زیادہ کڑ کڑ کرنے والی مرغی انڈہ نہیں دیتی اسی طرح اس لفظ سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ بہر کیف میرے خیال کے مطابق ملک کی حالت کا اقتضا ہے کہ مقابلے کے امتحان کا سیدھا سادھا طریق یہاں رائج نہ کیا جائے۔ ملک کے لئے سب سے بہتر طریق وہی ہے جو سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی نے اپنی تقریر میں بتایا ہے یعنی ایسا مسابقہ جس میں انتخاب اور نامزدگی دونوں کی آمیزش ہو۔

ایک اور چیز جس کی طرف میں توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں آنریبل ممبر[1] (جو شملہ سے منتخب ہوئے ہیں) کی تقریر جس کا انداز واعظانہ تھا اور جس میں انہوں نے اچھوتوں کی وکالت کی ہے سن کر بہت خوش ہوا۔ میں اس تقریر کا خیر مقدم کرتا ہوں اگرچہ میں اس معاملہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے فتوے کا مجھے علم نہیں (لالہ موہن لال: ان کی رائے وہی ہے جو میری ہے) ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ انہوں نے اپنے ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار کو اس بات پر ذات برادری سے خارج کر دیا تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کی شادی ایک چھوٹے طبقے کے برہمن سے کر دی تھی (لالہ موہن لال: انہوں نے ایسا نہیں کیا) یہ اخباروں میں شائع ہو چکا ہے اور پنڈت جی سے کہا بھی گیا تھا کہ وہ اُن کھلی چٹھیوں کا جواب

---

[1] لالہ موہن لال۔ بی اے۔ ایل ایل بی۔

دیں جن کا خطاب اُن سے تھا لیکن اُنھوں نے کوئی تردید شائع نہیں کی۔
بہرحال میں اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں بشرطیکہ یہ صرف لفظی طور
پر نہ ہو اور میں امید کرتا ہوں کہ میرے شملہ سے منتخب شدہ آنریبل دوست[1]
کی کوششوں کی بدولت یہ صوبہ چھوت چھات کی لعنت سے پاک ہو
جائے گا۔ سنا ہے کہ جنوبی ہندوستان میں اگر کسی برہمن کو کسی اچھوت
سے بات کرنی ہو۔ تو وہ اپنا مخاطب کسی نزدیک کی دیوار یا درخت کو
بناتا ہے اور اسی طرح جواب میں اچھوت کو اپنا مخاطب اسی دیوار یا
درخت کو بنانا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ برہمن کی تقدیس
اسے شودر سے خطاب کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ دن کتنا اچھا
ہوگا جب یہ تمام پابندیاں بالکل دور ہو جائیں گی اور اس صوبے کے
ہندو مساوات کے اچھے اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے۔

جناب عالی! مجھے اصول مسابقہ کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ میرے دوستوں نے موجودہ نظام کی چند خامیاں گنوائی
ہیں۔ نیز انھوں نے اس اصول کی کامیابی کے سلسلے میں دوسرے
ملکوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس ملک کے
حالات دوسرے ملکوں کے حالات سے قطعاً مختلف ہیں۔ اسی لئے
وہ اصول جو دوسرے ملکوں میں مفید ثابت ہوئے ہیں اس ملک میں
قابل عمل نہیں ہیں۔ اس ملک میں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی تباہی د

---

[1] سردار اجل سنگھ۔ ایم۔ اے ۔

بربادی کے درپے رہتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہو انہیں چاہیئے کہ اس ملک میں رہنے والے ہر فرقے کو یکساں طور پر بلند کرنے کی کوشش کریں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ موجودہ طریق "نیشنلزم" کی ترقی میں سدِ راہ ہے۔ ایک قوم ہونا اچھا ہے یا نہیں۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں ایک قوم ہونا اچھا نہیں لیکن اگر اسے اچھا فرض بھی کر لیا جائے تو بھی میں یہ کہوں گا کہ سب سے پہلی ضروری چیز اس ملک کے مختلف فرقوں میں باہمی اعتماد پیدا کرنا ہے۔ بحالاتِ موجودہ مختلف فرقے ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ ایک فرقے کو دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ حالانکہ جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قومیت انسان دوستی اور محبت و مودت کی باتیں کرتے ہیں۔ چند دنوں کی بات ہے کہ میرے ایک دوست نے دو ہندو دوستوں کو باتیں کرتے سنا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ اب اپنی کیا پالیسی ہونی چاہیئے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ زبان سے قومیت قومیت کہتے رہو لیکن اندرونی طور پر اپنی نظر ہمیشہ اپنے فرقہ پر رکھو۔

طب یونانی اور آیورویدک کے پروٹیکشن پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء کو کی گئی!

جناب عالی! اس ملک میں یہ خیال بہت عام ہوتا جا رہا ہے کہ حکومت ایک طرف تو مغربی طب کی حمایت اور دوسری طرف ملکی طب کی عدم حمایت اس لئے کر رہی ہے کہ اس کے پیش نظر تجارتی اغراض ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نظریہ میں سچائی کس حد تک ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طب یونانی اور آیورویدک حکومت کی حمایت سے محروم ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود جو طب مغربی کی حمایت میں کہی جاتی ہیں اس کو اب بھی طب یونانی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ طب یونانی سے متعلق بہت سی کتابیں بالخصوص نجیب الدین سمرقندی کی تصانیف اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔ یورپ کے کتب خانوں میں بہت سی ایسی کتابیں موجود ہیں جن کے شائع ہونے سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں جو طب مغربی کی برتری کے قطعیہ طور پر قائل ہیں۔ ہم یہ امر بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کے باشندے قیمتی دواؤں کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے

ایسے نظام کو جو سستا ہو رواج دینا ضروری ہے۔ اس نکتے کے
پیش نظر میرا خیال یہ ہے کہ یونانی اور آیورویدک طبی نظام ہمارے لئے
زیادہ مناسب ہیں۔ یہ درست ہے کہ جس طریق پر ہماری دوائیاں
طیار کی جاتی ہیں وہ ناقص ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے
ہمیں ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو دوا سازی سکھائے۔ مجھے
یقین ہے کہ ہمارا اپنا دوا سازی کا طریق دوسرے طریقوں کے مقابلہ
میں ہماری صحت کے لئے زیادہ موزون ہے۔

اگر اصل موضوع سے تھوڑا سا انحراف ناگوار خاطر نہ ہو تو میں ایک
واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میرے قیام انگلستان کے دوران میں
میرے ایک انگریز دوست نے کہا کہ ہمارا کھانا پکانے کا طریق بالکل
غیر قدرتی ہے اور اس طرح خوراک کی اصل لذت پکانے کے دوران
میں مفقود ہو جاتی ہے اس نے مغرب کے کھانا پکانے کے طریقے کی بہت
تعریف کی۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ جیسا ہم اپنے کھانے کے ساتھ
کرتے ہیں مغرب والے ویسا ہی اپنی دواؤں کے ساتھ کرتے ہیں۔
آمدم برسر مطلب میرا خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ سنجیدگی سے دیسی طب
کی اصلاح کی کوشش کرے تو یہ طریقے اس ملک کے لئے بیحد مفید
ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہذا میں حکومت سے درخواست کروں گا کہ
اس معاملہ کی طرف زیادہ توجہ مبذول کرے۔

انکم ٹیکس کے اصولوں کو محاصل اراضی پر عائد کرنے کے ریزولیوشن پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کی گئی

جناب عالی! مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آنریبل وزیر مال[1] نے
لگان کے موجودہ سسٹم کو اس اصول پر جائز ثابت کرنے کی کوشش
نہیں کی کہ زمین حکومت کی ملکیت ہے۔ بلکہ انہوں نے بڑی ہوشیاری
سے یہ کام شملہ والے آنریبل ممبر[2] کے لئے رکھ چھوڑا۔ میرے خیال میں
اس موقعہ پر پنجابی کی مزاحیہ کہاوت "چوروں نالوں پنڈ کاہلی" یعنی مال
مسروقہ چور سے زیادہ بھاگا جاتا ہے۔ بہت موزوں معلوم ہوتی ہے۔
(ایک آواز: چور کون ہے؟) آپ جسے چاہیں سمجھ لیں۔ چونکہ شملہ والے
ممبر نے یہ سوال اٹھایا ہے اس لئے اس کے متعلق مجھے چند باتیں کہنی
پڑیں۔ شملہ کے نمائندہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پیرون نامی ایک فرانسیسی
سب سے پہلا یورپین مصنف تھا جس نے ۱۷۷۷ء میں اس نظریہ کی تکذیب
کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۰ء میں برگز (BRIGGS) نے ہندوستانی قانون
و رواج کی رو سے حکومت کے مالکانہ حقوق کے متعلق وسیع تحقیقات

---

[1] سر فضل حسین۔ [2] لالہ موہن لال۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں منو کے قوانین، اسلامی قوانین اور ان دیگر طریقوں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں۔ مثلاً بنگال۔ مالوہ اور پنجاب میں رائج ہیں بالکل صحیح نقشہ پیش کرتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی دور میں بھی حکومت نے زمین کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بہرکیف لارڈ کرزن کے عہد میں یہ نظریہ پیش کیا گیا لیکن ٹیکس کمیٹی کی رپورٹ نے جو کچھ عرصہ بیشتر چھپ چکی تھی یہ امر واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی وجہ سے آنریبل وزیر مال نے موجودہ رواج کی مدافعت اسی نظریہ پر نہیں کی۔ (وزیر مال: یہ ضروری نہیں) جناب عالی! اگر آپ کی رائے اور آنریبل وزیر مال کی خواہش ہو تو وہ اس نظریہ کی بنا پر دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر اپنی پہلی ہی تقریر میں انہوں نے اس اصول کی بنا پر لگان کے موجودہ سسٹم کے دفاع کی مطلق کوشش نہیں کی تھی۔ (وزیر مال: میں یہ چاہتا نہیں تھا)

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حکومت اس نظریہ پر اعتماد نہیں رکھتی۔ بہرصورت ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ لگان کا موجودہ طرز تعین کہاں تک انصاف پر مبنی ہے۔ مانا کہ یہ قابل عمل بھی ہے اور اس کی پشت پر دیرینہ روایات بھی۔ باینہمہ سب سے پہلے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ انصاف بھی ہے یا نہیں؟ میں تو یہ عرض کروں گا کہ یہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے اور اس کی غیر معقولیت بالکل واضح ہے۔ زمیندار

چھوٹا ہو یا بڑا اُسے ہر حالت میں لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر
کسی شخص کی آمدنی زمین کے علاوہ دوسرے ذرائع سے ہو اور یہ
سالانہ آمدنی دو ہزار روپیہ سے کم ہو تو اسے کوئی ٹیکس ادا نہیں
کرنا پڑتا۔ اور یہی بے انصافی ہے۔ کوئی شخص بھی اس طریقہ کی غیر
معقولیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کہنے کی تو کوئی تک نہیں کہ چونکہ
اس بے انصافی کو دور کرنے کی راہ میں ناقابلِ عبور مصائب حائل
ہوتی ہیں اس لئے اس لعنت کو مستقل بنا دیا جائے۔ ہمیں اس ظلم
کا اعتراف کر لینا اور حتی الوسع اس کو دور کرنے کے لئے مناسب
باب کرنا چاہئیے۔ مجھے یہ ماننے میں قطعی تامل نہیں کہ انکم ٹیکس
کے اصول کو زمین کے لگان پر چسپاں کرنے میں خطرناک مشکلات
ہیں۔ دراصل پچھلی مرتبہ میرے قریب قریب اسی قسم کے ایک ریزولیوشن
واپس لے لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے مذکورۃ الصدر شدید
مشکلات کا احساس تھا۔ نیز یہ کہ ابھی اس معاملہ میں مزید تحقیق درکار
تھی۔ ہر چند اس وقت جو مشکلات میرے ذہن میں تھیں ان کا وزیرِ
مال نے بالکل ذکر نہیں کیا نہ ہی مجھے اب ان کے ذکر کرنے کی ضرورت
ہے تاوقتیکہ میں اس بارے میں دوسرے ممبران کے خیالات نہ جان
لوں۔ (ایک آواز: پھر تو آپ بدل نہیں سکیں گے) بدیں صورت میں ایوان
کو وہ مشکلات نہیں بتانا چاہتا جو میرے ذہن میں تھیں۔ (ایک آواز
کیا یہ کوئی راز ہے) یہ ایک کھلا ہوا راز ہے جس پر آفیشل سیکرٹس ایکٹ

(Official Secrets Act) کا نفاذ نہیں ہوتا۔

فاضل وزیر مال نے دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ اوّلاً وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں روپے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ صوبے کو ترقی کرنے کے لئے روپیہ درکار ہے لیکن گورنمنٹ کیمیاگری نہیں کرتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو اس وقت تک کیمیاگری کی ضرورت نہیں جب تک کہ اس کے قبضہ میں وہ کسان ہیں جن کی محنت و مشقت مٹی کو سونا بنا دیتی ہے۔ لیکن اس قسم کی دلیل تو ہر اس بُرے عمل کے دفاع میں پیش کی جا سکتی ہے جس سے حسب ضرورت روپیہ فراہم ہو سکے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ دلیل کچھ وزن رکھتی ہے پھر بھی میں یہ گزارش کرونگا کہ لگان کے طریقے میں ترمیم کے سبب مالگزاری میں جو کمی واقع ہو وہ دوسرے طریقوں سے پوری کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہم نظم و نسق کے اخراجات میں کمی کر سکتے ہیں یا انکم ٹیکس ایکٹ کے ماتحت قابل محصول آمدنی کی حد کو کم کر سکتے ہیں۔ ہم "ترقیات" پر کم خرچ کر سکتے ہیں جس کا نام تو کافی شاندار ہے لیکن جس سے اب تک ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نیز ہم اس کمی کو ان تخفیفات سے بھی پورا کر سکتے ہیں جو حکومت ہند نے کی ہیں۔

ثانیاً۔ آنریبل وزیر مال کی یہ دلیل ہے کہ مالگزاری کا یا تو سارا بوجھ صارف کے کندھوں پر پڑتا ہے یا صارف بالواسطہ اس بوجھ کے کچھ حصہ کا حامل ہوتا ہے۔ دلیل بظاہر تو معقول ہے۔ لیکن ذاتی

طور پر مجھے اس کے جواز میں شک ہے۔ ہمیں صوبے کی صورت حالات کو کبھی بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ ہم بٹائی کے طریق کو بہت عرصہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (وزیر مال: ابھی نہیں) عملی طور پر تو ایسا ہو چکا ہے۔ قانون لگان اراضی بٹائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ (وزیر مال: تاحال ایکٹ میں اس قسم کی کوئی ترمیم نہیں ہوئی) عملی طور پر بٹائی کا طریق ختم ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم میرے زمیندار بھائیوں کا اس سلسلہ میں کیا رویہ ہو۔ میرے خیال میں معاشی نقطہ نظر سے تو بٹائی ہی کا طریق بہتر ہے۔ بہر حال زمینی پیداوار کی قیمتوں کا تعین صارف کی طلب سے ہوتا ہے اور جیسا کہ آنریبل وزیر خزانہ[1] نے فرمایا ہے۔ زمین کے لگان کا تعین قیمتیں کرتی ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ لگان کا تعین ہو جاتا ہے تو پھر سالوں وہی شرح چلتی رہتی ہے۔ اگر شرح مقرر ہونے کے بعد قیمتیں زیادہ ہو جائیں تو بیچنے والے کے لئے منافع کا امکان ہے لیکن اگر قیمتیں کم ہو جائیں تو میرا یہ خیال ہے کہ زمین کے لگان کا کوئی حصہ بھی صارف پر نہیں پڑتا۔ (وزیر مال: اگر قیمتیں بڑھ جائیں) بہر حال یہ موقع کی بات ہے۔ کہ قیمتیں بڑھ جائیں یا کم ہو جائیں (وزیر مال: تب صارف کو دینا پڑتا ہے)

مجھے اس کے متعلق زبردست شکوک ہیں۔ تمام صورت حال کا انحصار اتفاق پر ہے۔ اگر قیمتیں بڑھ جائیں تو منافع کے امکانات ہیں لیکن اگر قیمتیں کم ہو جائیں تو آنریبل وزیر مال کی دلیل کا اطلاق ہی

---

[1] سر جعفری ڈی مونٹ مورنسی۔

ممکن نہیں۔ مصارف تعین لگان میں تو ضرور مدد کرتا ہے لیکن لیو ازاں
تمام دارومدار اتفاقات پر ہے۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ بالخصوص
بارانی علاقوں میں پیداوار غیر یقینی ہوتی ہے۔ آنریبل وزیر مال نے
یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ یا تو اس نظام کو جاری رکھا جائے یا پھر یک
قلم منسوخ کر دیا جائے۔ تیسری کوئی ممکن صورت نہیں ہے۔ اس ضمن
میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ رہتک والے آنریبل ممبر[1] کے پیش کردہ
ریزولیوشن کی اصلی روح یہ نہیں ہے۔ بلکہ منشا یہ ہے کہ اگر آپ یہ تسلیم
کر لیں کہ موجودہ سسٹم غیر منصفانہ ہے تو اسے دور کرنے کے لئے کچھ
کیجئے۔ اس سلسلہ میں میرے پیشرو ممبران واضح تجاویز پیش کر چکے ہیں۔
میرے خیال میں انکم ٹیکس کے اصول کو لگان سسٹم میں مکمل طور پر
ٹھونسے بغیر بھی قانون لگان اراضی دفعہ ۴۸ میں ترمیم کرنے سے ایسا
ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں پہلے ہی ایک ترمیم پیش کر چکا
ہوں اگرچہ میرے خیال میں حالات اس ترمیم کے لئے سازگار معلوم
نہیں ہوتے۔ لہٰذا اب میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ پانچ بیگھے تک وہ
تمام زمینیں جہاں آبپاشی نہ ہو اور جہاں پیداوار قطعی طور پر معین ہو،
لگان سے مستثنیٰ قرار دی جائیں آیا انکم ٹیکس کے اصولوں کا اطلاق لگان
اراضی پر کیا جائے یا نہیں۔ اس سوال کا فیصلہ کئے بغیر بھی ایسا کیا
جا سکتا ہے اگر آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ پانچ بیگھے تک کی تمام زمینیں

---

[1] رائے صاحب چودھری (بعد میں چودھری سر) چھوٹو رام۔

لگان سے مستثنیٰ ہیں، تو میرے خیال میں اس سے لگان میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہوگی۔ بہرکیف اگر کوئی معتدبہ کمی ہو بھی جائے تو میرے خیال میں وہ دیگر اطراف میں خرچ گھٹانے سے پوری کی جا سکتی ہے۔

اب رہ گئی آنریبل وزیر مال کی وہ دلیل بلکہ ان کا ظاہر کردہ خدشہ کہ ممکن ہے یہ ریزولیوشن نوزائیدہ لینڈ ریونیو بل کی موت کا باعث ہو جائے اور اس طرح ہم بچہ کشی کے مرتکب ہوں۔

میرے خیال میں ضبط تولید کے اس دور میں طفل کشی کوئی بری بات نہیں ہے۔ بالخصوص جبکہ نہیں معلوم ہو کہ بچہ بدکردار اٹھے گا، میرے خیال میں پانچ بیگھے تک قطعات اراضی کی لگان سے معافی کوئی بڑا مطالبہ نہیں ہے (ف مجھے امید ہے کہ حکومت اس معاملہ پر اچھی طرح غور و خوض کرے گی اگر اس حد کو پانچ بیگھے سے کم بھی کر دیا جائے تو ذاتی طور پر مجھے اس سے بھی اتفاق ہوگا۔ (وزیر مال: پانچ ایکڑ) اس صوبے میں منفعت بخش اراضی دس یا گیارہ بیگھے ہے اور پانچ بیگھے اس قسم کی ملکیت کا نصف ہے۔ میرے خیال میں پانچ بیگھے تک زمین کا لگان معاف کر دینے سے آمدنی میں کوئی خاص کمی نہ ہوگی (چودھری افضل حق: صرف دو کروڑ) میرے حساب سے تو کمی دو کروڑ سے بہت کم ہے (وزیر مال: اگر صرف دو ایکڑ تک کے مالکان کو معافی دی جاوے تو دو کروڑ سے کم ہوگی۔) اڑھائی ایکڑ (وزیر مال: گناہ بے لذت) اگر آپ اس گناہ بے لذت کا ارتکاب کریں تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ میں بھی انصاف کی کچھ حس موجود

ہے۔ اس سلسلہ میں ایک معزز ممبر نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کو روس بھیجنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ متعدد کمیشن روس ہو آئے ہیں۔ اگرچہ اس ملک سے کوئی نہیں گیا۔ میرے معزز دوست کو شاید ان اسباب کا علم نہیں جو انقلاب روس کا پیش خیمہ ہیں۔ ان اسباب کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا بھی ضروری نہیں۔ انقلاب روس کے بعد سے ان واقعات کے متعلق جو وہاں ظہور پذیر ہوئے اور اس نظام کے متعلق جو آجکل وہاں رائج ہے۔ کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ برٹرینڈ رسل ایسے مشہور مصنفین اور دوسرے اشخاص کی جنہوں نے اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے، کتابیں موجود ہیں۔ میرے خیال میں میرے معزز دوست پنڈت نانک چند نے چودھری افضل حق کی اس تجویز کا پہلے ہی مسکت جواب دے دیا ہے یعنی اس وقت پنجاب کا زمیندار اپنی مالکانہ حیثیت کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس ملک میں ایسے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ہیں جن کی کل ملکیت دو بیگھے یا دو کنال ہے۔ ہر چند کہ اُن کی حیثیت مزارعین کی سی ہے تاہم وہ انفرادی ملکیت کے حقوق سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ لہذا میری گزارش ہے کہ حکومت کو ریزولیوشن کے مطالبہ پر غور کرنا چاہیئے تاکہ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لئے جن کی زمین پیداوار ان کے خاندانوں کی پرورش کے لئے بھی قطعی طور پر ناکافی ہے کوئی بہتری کی صورت نکل سکے۔

بجٹ ۳۰-۱۹۲۹ء پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۴ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء کو کی گئی

جنابِ عالی! کونسل کے سامنے پیش کردہ بجٹ ایسی مالی حالت کا آئینہ دار ہے جس کو میرے خیال کے مطابق آنریبل وزیر خزانہ[1] کے الفاظ میں بڑے سے بڑا رجائی بھی بالکل تسلی بخش خیال نہیں کر سکتا۔ نیز وہ بیان جس کے ساتھ یہ بجٹ پیش کیا گیا ہے اس قدر جامع اور بے لاگ ہے کہ اس کے بے لاگ ہونے کی وجہ سے ہی بجٹ پر کسی قسم کی تنقید کرنا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال اس میں چند چیزیں ایسی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس بجٹ کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے اور اس لحاظ سے یہ پہلا بجٹ ہے کہ اس میں حکومت ہند کے حصے کی کوئی رقم نہیں۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پانچ سال کی متواتر خوشحالی کے بعد بھی ہمارے سامنے پہلی مرتبہ خسارے کا بجٹ آیا ہے۔ آبکاری اور سٹیمپس (stamps) میں تھوڑا سا اضافہ ہرگز باعث اطمینان نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صوبے میں شراب خوری اور مقدمہ بازی بڑھ گئی ہے جس پر نہ حکومت فخر کر سکتی ہے اور نہ عوام۔ سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء کے بجٹ میں صرف آبپاشی اور جیلوں کے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے۔ آبپاشی میں اضافہ گزشتہ

---

[1] مسٹر اے۔ ایم سٹو۔ او۔ بی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس۔

کے سیلابوں کی وجہ سے ہے اور جیلوں میں اضافہ کی وجہ قیدیوں کی تعداد
میں زیادتی اور خوراک کی گرانی ہے۔ سیلاب ایک قدرتی امر ہے جس کو
روکا نہیں جا سکتا۔ اگرچہ ہم ہر چیز کو قسمت کے سر تھوپنے میں
یقین رکھتے ہیں تاہم جرائم کو ضرور کم کیا جا سکتا ہے۔ اور جرائم کے انسداد
کے لئے اگر ہم مناسب ذرائع عمل میں لائیں تو کافی حد تک ان کو روکا جا
سکتا ہے۔ اس وقت تو حالات یہ ہیں کہ اگر کوئی آدمی ۱۰ روپے کی مرغی
چرا لے تو اسے دو سال کے لئے جیل خانہ بھیج دیا جاتا ہے میرا خیال ہے کہ
جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں اضافے کا بہت حد تک یہی باعث ہے۔
۱۹۲۹-۳۰ء کے تخمینہ بجٹ میں سب سے مقدم غور طلب مسئلہ تعلیم کا ہے۔
یادداشت کے گراف نمبر ۳ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تعلیم کیلئے ۱٫۸۱ کروڑ
رقم وقف کی گئی ہے۔ آنریبل وزیر مال کے بیان میں صفحہ ۵ پر رقم ۱٫۶۷
دی ہوئی ہے۔ میں ان اعداد کے سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ اگر ۱٫۶۷ میں
نئے اخراجات کے لئے ۱۲ لاکھ جمع کئے جائیں تو میزان ۱٫۷۹ ہوتی ہے
نہ کہ ۱٫۸۱ (مسٹر جے جی بیز لے: کیا میں یہ بتانے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس میں
وہ رقوم بھی شامل ہیں جو تعمیرات، ومرمتی کاموں اور سٹیشنری پر خرچ ہونگی) بہت خوب
جناب جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے یہ صورت بہت ہی مایوس کن ہے۔ بلکہ
میں کہنے والا تھا کہ وحشت انگیز ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۵۵ نئے مدرسوں
نے امدادی رقوم کے واسطے درخواست کی جن میں اسلامیہ سکولوں کی
تعداد صرف ۱۶ تھی۔ کل زر اعانت کی میزان ۱٫۲۱٫۹۰۶ روپیہ تھی جس

میں سے اسلامی سکولوں کو صرف ۹۰،۲۱۴ روپیہ ملا۔ ۱۹۲۶-۲۷ء میں ہائی سکولوں کے واسطے جو امدادی رقوم دی گئیں اُنکی میزان ۲۲،۴۲،۸۷۱ روپیہ ہے اور اسلامی مدرسوں کا حصّہ صرف ۲۹،۲۱۴ روپیہ رہا جو تمام رقم کا صرف ۲۳ فیصدی ہے۔ ۱۹۲۷-۲۸ء میں امدادی رقوم ۱۰،۱۴،۱۵۲ روپوں پر مشتمل تھیں اور اسلامیہ مدرسوں کا حصّہ صرف ۲،۰۴،۲۳۰ رقم بنا۔ یعنی آبادی کے اس حصّہ کو جو تعلیم کے لحاظ سے سب سے زیادہ پیچھے ہے اور قرضے کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے ۱۰ لاکھ میں سے کل ۲ لاکھ مل سکا۔ یہ صورت حالات کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں کہلا سکتی۔ پھر ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ رفاہی محکموں میں کافی بچت ہے اور مسٹر پیپی[1] کے بیان کے مطابق یہ زیادہ بجٹ بنانے کی مثالیں ہیں۔ میں تعلیم پر بڑی رقوم خرچ کرنے کے خلاف نہیں ہوں اور نہ ہی اس بحث کا مقصد کسی قسم کی مخالفت ہے۔ لیکن میں یہ گزارش کروں گا کہ تعلیم پر جو روپیہ خرچ کیا جائے اس میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور اس کی تقسیم مساوی اور منصفانہ ہونی چاہیئے، بالخصوص ان علاقوں میں جہاں تعلیم کم ہے اور لوگ تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ بہرحال میں اس معاملہ پر کچھ زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب ایوان کے سامنے ستھارا یک تحقیقات پیش ہونگی تو اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

اب میں چند باتیں کیپیٹل (Capital) اخراجات کے متعلق کہوں گا۔

---

[1] فائنینس سیکرٹری۔ حال فائنینشل کمشنر ترقیات۔

۱۹۲۸-۲۹ء میں ایسے اخراجات کا تخمینہ بجٹ جو آمدنی سے وصول ہونا تھا ۱۰۰٫۱ لاکھ تھا۔ بعد میں اسے بڑھا کر ۱۰۸٫۹ لاکھ کر دیا گیا اور نظرثانی شدہ تخمینے میں یہ رقم ۱۱۲٫۲ لاکھ ہو گئی ہے۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں کیپٹل اخراجات کا اندازہ ۴۵٫۰۱ لاکھ ہے۔ چونکہ غیر معمولی رسیدات سے زیادہ رقم نہیں ملے گی اس واسطے صوبجاتی قرضہ فنڈ سے ۱۴۰ لاکھ روپیہ قرض لینے کی تجویز ہے۔ حالات کی یہ زبوں حالی نہایت افسوسناک ہے۔ ہمارا صوبہ پہلے ہی مقروض ہے۔ بجٹ کے صفحہ ۲۲-۲۳ سے آپ کو صوبے کی صحیح حالت کا پتہ لگ جائیگا۔ آپ دیکھیں گے کہ پبلک سے قرضوں کی تعداد تین کروڑ تک پہنچ جاتی ہے اور حکومت ہند سے ۳۱ مارچ سے پہلے اور آئندہ سالوں میں جو قرضہ لیا گیا ہے اس کی مجموعی تعداد قریباً ۲۶ کروڑ ہے اور پھر اس رقم میں وہ قرضہ جات شامل نہیں ہیں جن کی منظوری یکم مارچ ۱۹۲۹ء کے بعد دی گئی ہے اور اب ہمیں مزید ۲۰ لاکھ روپیہ قرضہ لینا پڑ رہا ہے۔ ان تمام امور کے باوجود اپنے بیان کے صفحہ ۴ پر آنریبل وزیر مالیات فرماتے ہیں:

"عمارات اور سڑکوں کی تعمیر کے پورے مجوزہ پروگرام پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ اور اب یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ اس مد پر ۱۹۲۹-۳۰ء میں ۱۹۲۸-۲۹ء کے نظرثانی شدہ تخمینے سے ۲۸٫۷ لاکھ روپیہ کم خرچ کیا جائے۔ یہ بھی زیر غور ہے کہ "ریونیو ریزرو فنڈ" میں ۱۹۲۸-۲۹ء میں پاس شدہ ۱۵ لاکھ کی بجائے صرف ۵ لاکھ روپیہ منتقل کیا جائے۔"

بقول چارلس لیمب، نوع انسان کی دو قسمیں ہیں، قرضخواہ اور قرضدار۔ میرے خیال میں جہاں تک اس صوبے کا تعلق ہے اگر ہم مذہبی امتیازات یعنی ہندو اور مسلم، اڑا دیں اور اس کی بجائے اقتصادی نشانات یعنی قرضخواہ اور قرضدار، اختیار کر لیں تو لیمب کی تقسیم ہم پر بالکل صادق آتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ صوبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقروض بن جائے گا۔ اسی لئے موجودہ صورت حالات نہایت مایوس کن ہے اور لگان کے نئے ذرائع سوچنا آسان کام نہیں۔

بہر صورت میں ایک تجویز پیش کروں گا۔ اوّلاً گورنمنٹ کو چاہیے کہ حکومت ہند کو اس بات پر آمادہ کرے کہ انکم ٹیکس کو صوبجاتی بنا دیا جائے۔ اس سے ہمارے صوبے کی حالت کسی حد تک سدھر سکتی ہے۔ ثانیاً یہ کہ انگلستان کی طرح ہمیں بھی اموات پر ٹیکس لگا دینا چاہیے۔ (وزیر مالیات: زندہ محصولات زیادہ موزوں ہیں) یہ زندہ محصولات ہی ہوں گے کیونکہ ان کی ادائگی وہی کرے گا جو زندہ ہے۔ ان محصولات کی وصولی کے لئے ایک حد مقرر کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایسے لوگ جنہیں ۲۰ یا ۳۰ ہزار روپیہ کی جائداد ورثہ میں ملے۔ ثالثاً ہمیں بڑی تنخواہیں کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مشینری ارزاں ترین منڈیوں سے خریدنی چاہیے۔

بجٹ ۳۱-۱۹۳۰ء پر تقریر

جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۷ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو کی گئی۔

جناب والا! صوبے کی مالی حالت جو اس بجٹ سے عیاں ہے اسکے متعلق میں چند عام باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ مسٹر پیکنی نے اپنی صاف اور واضح یادداشت میں صوبے کی مالی حالت کا لب لباب دیدیا ہے۔ صفحہ ۱۳ پر وہ فرماتے ہیں:۔

"کفایت شعاری کی خصوصی مساعی کے بعد بھی مواصلات آمدنی ۹۵ء۱۰ لاکھ ہیں اور اخراجات باوجود اس کے کہ ریونیو ریزرو فنڈ کیلئے کوئی رقم نہیں نکالی گئی ۲۲ء۱۱ لاکھ۔ اس طرح سال میں ۲۷ لاکھ کا خسارہ ہوگا۔ صرف یہ ایک امر تسلی کا باعث ہوسکتا ہے کہ سیلابوں کی وجہ سے جو مرمت ضروری ہوگئی ہے اس پر ۲۸ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اگر یہ رقم جو غیر معمولی قرار دی جاسکتی ہے نظرانداز کردیجاوے تو بجٹ متوازن ہو جاتا ہے"

مجھے ڈر ہے کہ مسٹر پیکنی جو تسلی پیش کررہے ہیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ یادداشت کے صفحہ ۱۶ پر وہ خود فرماتے ہیں:۔

" یادداشت کے شروع میں جو گراف ہے اس کے دیکھنے سے یہ امر ظاہر ہو جائیگا کہ ۳۱-۱۹۳۰ء تیسرا سال ہے جس میں ریونیو اکاؤنٹ میں

ملہ فنانس سیکرٹری - حال فنانشل کمشنر ترقیات۔

خرچ آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گزشتہ دو سالوں میں قسمت نے ہمارا
بالکل ساتھ نہیں دیا اور خسارہ کی معقول وجوہات ہیں۔ تاہم اس امر سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ہم ۱۹۲۱ء سے ابتک کے سالوں پر مجموعی طور پر نظر
ڈالیں تو اچھے اور بُرے سالوں کی تعداد برابر ہے اور ہمارا مالی نظام اس قسم کا
ہونا چاہیئے کہ کمی وبیشی بالکل فطری ہو۔

گزشتہ دس سالوں کے دوران میں جہاں ایک طرف ۱۹۲۹ء میں دریائے
جمنا میں اور ۱۹۲۹ء میں دریائے جہلم و دریائے سندھ میں غیر معمولی سیلاب
آئے اور ۱۹۲۱ء میں فصل ربیع فیل ہو گئی اور ۱۹۲۵ء میں گندم کی فصل کو ایک
عجیب وغریب قسم کا حادثہ پیش آیا اور ۱۹۲۶ء میں کپاس کو ایک بیماری لاحق
ہو گئی وہاں دوسری طرف زمین کے لگان میں جو خوش قسمتی سے گزشتہ پانچ سال
میں دوبارہ مقرر ہونا تھا منافع کی صورت نکل آئی۔ اسی طرح ۱۹۲۱ء سے
۱۹۲۶ء تک فصلیں بہت عمدہ ہوئیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ حکومت
ہند نے ہمارے صوبجاتی چندہ کو بالکل معاف کر دیا۔ اور نہری آبپاشی کی مستقل
توسیع نے صوبے کی خوشحالی اور مواصلات کو زیادہ محفوظ بنا دیا ہے۔ آئندہ ترقی
کی تجاویز پر خرچ کرنے کیلئے ہمارے ذرائع بھی بڑھ گئے ہیں۔ گزشتہ ۹ سالوں کے
کے تجربے کی روشنی میں ۳۱-۱۹۳۰ء کا بجٹ ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے"
میں سطور ذیل کی طرف آپکی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں:۔

"ریونیو اکاؤنٹ میں خسارہ کی وجہ سیلابوں کی تباہی کے سبب مرمت
ہو سکتی ہے لیکن اس سے بڑی اہم بات یہ ہے کہ اگر مرمت کی لاگت نکال دی

چاہیے تو بجٹ کو وقت ہی کیساتھ متوازن کیا جا سکتا ہے یعنی اس طرح کہ بہت
سے ایسے کاموں کو چھوڑ دیا ہے جنکو اسمبلی کی منظوری مل چکی ہے اور اگر غیر
متوقع تاخیر اور کفایت شعاری کی ضرورت نہ ہوتی تو یہ چیزیں اب تک زیر
تعمیر ہوتیں "

زاں بعد مسٹر پیبنی موجودہ مالی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور خود اپنے الفاظ
میں ایک حد تک مایوس کن نتیجہ پر پہنچتے ہیں یعنی یہ کہ صورت حال وقتی نہیں
بلکہ دیر تک قائم رہنے والی ہے۔ اُن کے الفاظ ہیں :-

" سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء کے بجٹ کے مطالعہ سے ہم کو اس حد تک مایوس کن نتیجہ
پر پہنچنے سے مفر نہیں کہ موجودہ صورت حال وقتی نہیں ہے جس کیلئے موسمی
مصائب یا سیلابی آفات کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے بلکہ یہ ایک دیرپا صورت ہے "

ہم سب کو معلوم ہے کہ ہمارا صوبہ پہلے ہی مقروض ہے۔ بیکاری کا مسئلہ روز بروز
خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ تجارت کا بھی بُرا حال ہے۔ ان حالات کے پیش نظر
آپ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں تک مالی صورت کا تعلق ہے ہمارا مستقبل
کیا ہے؟ میری رائے تو یہ ہے کہ موجودہ صورت حالات تبدیل نہ ہوئی تو مالی آمدنی کی رُو
سے نہیں ہے اصل سبب ہمارا طرز نظم ونسق ہے جسکی وجہ سے بیحد تنخواہیں دینی پڑتی
ہیں اور طرفہ یہ کہ صوبے کے باشندوں کو ان تنخواہوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔
میرے خیال میں صوبے کے سامنے اس وقت تین ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ موجودہ
نظام قائم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسکے تمام تلخ نتائج مثلاً خسارے والے
بجٹ، مذہبی مناقشات، فاقہ کشی، قرضہ اور بیکاری۔ دوسرا یہ کہ موجودہ نظام

کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے اور تیسرا راستہ یہ ہے کہ موجودہ نظام کی شکل تو یہی رہے لیکن ہمیں یہ اختیار ہو کہ ہم اس نظام پر تھوڑا خرچ کر سکیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر آپ آرام سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ نظام کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ موجودہ طریق نظم و نسق پر ہم دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا ملک نظم و نسق پر اتنا روپیہ خرچ نہیں کرتا (مسٹر کالورٹ: سوال؟) معزز ممبر اپنی باری پر جواب دے سکتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہمارے مالیہ کے پیش نظر ہمارے موجودہ اخراجات کا کوئی جواز نہیں۔ جہاں تک ان اخراجات کا تعلق ہے جن میں ہماری کچھ آواز ہے میں اس تجویز کی تائید کروں گا کہ ہم ایک تحقیقاتی کمیٹی بنانی چاہیئے جو یہ دیکھ سکے کہ کسی مزید تخفیف کی گنجائش ہے یا نہیں۔

اب میں صنعت و حرفت اور تعلیم کے متعلق چند جملے کہنا چاہتا ہوں۔

صنعت و حرفت پر ہمارا خرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جیسا کہ میں اس سے قبل بھی کئی موقعوں پر کہہ چکا ہوں اور جیسا کہ دوسرے مقررین نے اشارہ کیا ہے صنعتی ترقی سے ہی ہم اپنے آپ کو بیکاری کی لعنت سے بچا سکتے ہیں۔ اس صوبے میں پارچہ بافی اور پالش سازی کی صنعتوں کے لئے اچھا مستقبل ہے اور اگر ہم ان صنعتوں کی ترقی میں ممد ہوں یعنی یہ کہ ہم احمد آباد اور کانپور کے مقابلہ میں ان کا تحفظ کر سکیں تو ہم اس صوبے کو بیکاری سے ضرور نجات دلا سکتے ہیں۔

ہم نے تعلیم پر زر کثیر صرف کیا ہے لیکن نتیجہ؟ اس صوبے کی تعلیمی ترقی کی رپورٹ سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ سکولوں کی تعداد میں تقریباً

....۱ اور طالب علموں کی تعداد میں ...۲۷ کی کمی واقع ہوگئی ہے رپورٹ میں اس کمی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ سکول کے انسپکٹروں نے تعلیمی پروپیگنڈے میں لاپروائی کی۔ میں یہ باور کرنے کیلئے طیار نہیں۔ کہ اصل وجہ یہ ہے۔ اس کا حقیقی سبب کچھ اور ہی ہے۔ وزیر تعلیم کی گذشتہ تین سال کی کارگزاری کے متعلق میرے پاس اعداد و شمار کی نقل موجود ہے لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے میں ان تمام اعداد کا یہاں ذکر نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی توجہ ان خصوصی امدادوں کی طرف منعطف کراؤں گا جو ۲۹-۱۹۲۸ء میں غیر امدادی سکولوں کو ملی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے سکولوں کی تعداد جن کو یہ امداد ملی، ۲۱ ہے اس میں سے ۱۳ ہندو مدرسہ ہیں ۶ سکھ مدرسے اور صرف ۲ مسلم مدرسے۔ ہندو مدرسوں کو جو امداد ملی اس کی میزان ۱۶٫۹۷۳ روپیہ ہے سکھ مدرسوں کو ۹٫۹۰۸ روپے کی امداد ملی اور مسلمان مدرسوں کو صرف ۲٫۲۲۰ روپیہ کی امداد۔ لہٰذا اس قابلِ غور و توجہ کی اصل وجہ وہ طریق ہے جس سے تعلیم پر روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔

لہ آنریبل مسٹر (حال سر) منوہر لال +

حصہ دوم
اسلام اور قادیانیت

حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے، یہ
رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے۔
اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب
کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس
قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۱) قادیانی اور جمہور مسلمان

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے نہایت اہم سوال پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حال ہی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ انگریزی قوم کو ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اس مسئلہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کروں۔ لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا۔ البتہ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جو تمام ہندی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ ہے۔ میں نہایت مسرت سے کچھ عرض کروں گا۔ لیکن میں آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ اور نہ میں قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لئے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لئے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

ہندوستان کی سرزمین پر بیشمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے۔ کیونکہ ان مذاہب کی بنا کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی۔ اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی

کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے۔ اس لئے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں سے زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لئے مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لئے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو۔ لیکن اپنی بنا نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے۔ مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کرے گا۔ اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختم نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے اجراء کا تخیل نہایت لازم تھا۔ چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت رہتی تھی۔ غالباً یہ حالت انتظار نفسیاتی حظ کا باعث تھی۔ عہد جدید کا انسان روحانی طور پر موبد سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہو نہیں اور اُن کی جگہ مذہبی عیار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے مُلاّ تے پریس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے قبل اسلامی نظریات کو بیسویں صدی میں رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام،

جو تمام جماعتوں کو ایک رسّی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لئے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لئے مزید افتراق کا باعث بنے۔

اس قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے۔ میرے نزدیک، اُن میں بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے۔ کیونکہ وہ کھُلے طور پر اسلام سے باغی ہے۔ لیکن مؤخّر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔ لیکن باطنی طور پر اسلام کی رُوح اور مقاصد کے لئے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصوّر کہ جس کے پاس دشمنوں کے لئے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں۔ اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیّل اور اس کا رُوحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیّت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں۔ گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجُوع ہے۔ رُوحِ مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جُزو ہے۔ پولی مسیح بال شیم (Baalshem) کا ذکر کرتے ہُوئے پروفیسر بوبر (Buber) کہتا ہے کہ "مسیح کی رُوح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطہ سے زمین پر اتری"۔ اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اُٹھیں اور اُنہوں نے بروز، حلول، ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں۔ تاکہ تناسخ کے اس تصوّر کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لئے لازم تھا۔ کہ وُہ مسلم کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں حتیّٰ کہ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں، بلکہ اجنبی

ہے - اور اس کا آغاز بھی اسی مجوسیانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخی اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو پروفیسر ونسنک (Wensinck) نے اپنی کتاب موسومہ "احادیث میں ربط" میں نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اوّلین تاریخی شواہد پر حاوی ہے۔ اور یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلاف نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہ کیا؟ یہ اصطلاح انہیں غالباً اس لئے ناگوار تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ مجوسی ذہن وقت کو بدور حرکت تصور کرتا تھا۔ صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت عظیم مسلمان مفکر اور مؤرخ یعنی ابن خلدون کے حصہ میں تھی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدتِ احساس کا ثبوت دیا ہے۔ وہ جدید اجتماعیات کے طالب علم کے بالکل واضح ہے۔ عام مسلمان، جسے پچھلے دن سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک صاحب نے ملا زدہ کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔ اگرچہ اسے ختمِ نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختمِ نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے اسے حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔ اگر سر ہربرٹ ایمرسن مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیں تو میں

انہیں معذور سمجھتا ہوں، کیونکہ موجودہ زمانے کے ایک فرنگی کے لئے جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو۔ اس کے لئے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کے اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات بہت غیر معمولی ہیں۔ اس ملک کی بے شمار مذہبی جماعتوں کی بقا اپنے استحکام کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ جو مغربی قوم یہاں حکمران ہے، اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت سے کام لے۔ اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بد قسمتی سے بہت برا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے۔ جتنا حضرت مسیح ؑ کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے۔ اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتی۔ بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلادے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعر عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا ہے

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

ہیں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ کے لیے پوری ہمدردی رکھتا ہوں۔ جو انہوں نے نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کی ہے۔ یقیناً یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تخیل کو دخل نہیں دیتے۔ حکومت کو موجودہ صورت حالات پر غور کرنا چاہیئے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے، عام مسلمان کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو، تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تلعب بالدین کرتے پائے، اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ سے جھٹلایا جائے۔ پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے۔ حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔

اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے۔ تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے۔ جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقام پر یہ دہرا لینے کی غالباً ضرورت

نہیں کہ مسلمانوں کے بیشمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا اُن بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مذہبوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں۔ اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو ہی اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا۔ جس کی شکل روس کی دہریت یا دہریت سے ملتی جلتی ہوگی۔

لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں۔ جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں۔ لیکن اُن کی اہمیت بھی مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے۔ وہاں میں حکومت کو اقتساب خولیش کا مشورہ دوں گا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لئے کون ذمہ دار ہے، جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اور دیہاتی حصہ خود بہت سے گروہوں میں بٹ گیا ہے، جو ہر دم آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔

سر ہربرٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔ اے کاش، وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری - دیہاتی تمیز نے، جسے وہ خود غرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعہ برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنادیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رہنما پیدا کرسکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہوسکے۔ سر ہربرٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنادیا ہے۔

ضمیمہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے اس بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اور یہ خیال کیا جارہا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ دقیق مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بہ جبر انسداد کردے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے۔ اگرچہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔ جنہیں خطرہ محسوس ہو، انہیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔ میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم

کرلے - یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا - اور مسلمان اُن سے
ویسی رواداری سے کام لے گا۔ جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں
اختیار کرتا ہے۔

(۲) "لائٹ" کے جواب میں

(مذکورہ بالا بیان پر تنقید کرتے ہوئے قادیانی ہفتہ وار "لائٹ" نے
لکھا کہ " اور بہت سے بڑے مفکروں کی مانند ڈاکٹر اقبال بھی الہام
پر یقین نہیں رکھتے " اس اتہام کے متعلق جب ایک پریس کے نمائندہ
نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی، تو آپ نے فرمایا:)

"لائٹ" نے اپنے الزام کی بنیاد میرے اس شعر پر رکھی ہے ؎

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سلیس اُردو ہے، جس کا مطلب محض یہ ہے کہ انسان کی روحانی
زندگی میں ہم کلامی سے آگے بھی ایک منزل ہے - لیکن شعر کو وحی کے
دینی معانی سے کچھ تعلق نہیں - اس سلسلہ میں "لائٹ" کی توجہ اپنی کتاب
"تشکیل نو"[1] کی طرف مبذول کراؤں گا - جہاں صفحہ ۲۱ پر میں نے لکھا ہے
کہ احساس اور تخیل کے فطری رشتہ سے وحی کے متعلق اس اختلاف پر
روشنی پڑتی ہے - جس نے مسلم مفکرین کو کافی پریشان کیا تھا - غیر واضح احساس
اپنے منتہا کو تخیل کے اندر پاتا ہے اور خود تخیل لباس مجاز میں آنے کی سعی

[1] "اسلامی تفکر کی تشکیل نو" مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

کرتا ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے کہ تخیل اور لفظ دونوں بیک وقت بطنِ
احساس سے پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ ادراک انہیں وجود میں لا کر خود اپنے
لئے یہ دشواری پیدا کرتا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے مختلف قرار
دے۔ اور ایک معنی میں لفظ بھی الہام ہوتا ہے۔

(جب ڈاکٹر صاحب سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا جس کا "لائیٹ"
نے حوالہ دیا تھا اور جس میں ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کے آنے کی
خبر دی گئی ہے تو آپ نے فرمایا:-

مدیر "لائیٹ" نے ایک ایسی حدیث کا حوالہ دیا ہے، جو تاریخی عمل
کی نہایت حسابی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں اگرچہ انسان کے روحانی
امکانات اور روحانی آدمیوں کی پیدائش کا قائل ہوں۔ تاہم مجھے یہ یقین
نہیں کہ اس تاریخی عمل کا حساب ویسے ہی لگایا جا سکتا ہے جیسے "لائیٹ"
کا خیال ہے۔ ہم بآسانی اعتراف کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کا شعور ہماری
ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔ میں منطقی رنگ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ
اس طرح مقرر اور حسابی نہیں ہے، جیسے "لائیٹ" نے سمجھا ہے۔ میں
ابن خلدون کی رائے سے بہت حد تک متفق ہوں۔ جہاں وہ تاریخی
عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے۔ نہ کہ ایسا عمل جو پہلے سے متعین
کیا جا چکا ہو۔ موجودہ دور میں برگساں نے اسی نظریہ کو زیادہ شستہ اور عمدہ
مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "لائیٹ" نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے۔
وہ غالباً جلال الدین سیوطی نے مشہور کی تھی۔ اور اسے زیادہ اہمیت نہیں

دی جا سکتی۔ بخاری و مسلم میں اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس میں چند بزرگوں کے تاریخی عمل کے نظریہ کی جھلک ہو تو ہو، لیکن افراد کے ایسے رویار کوئی دلیل نہیں بن سکتے۔ تمام محدثین نے اسی اصول کی پیروی کی ہے

(جب علامہ اقبال کی توجہ ایک اردو سے قادیانی ہفتہ وار "سن رائز" (Sunrise) کے ایک خط کی طرف مبذول کی گئی۔ جس میں علامہ صاحب کی ایک تقریر کا حوالہ دیکر ان پر تناقض خود (Inconsistency) کا الزام لگایا گیا تھا۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا:)

مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی۔ اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے، جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کتاب موسومہ "براہین احمدیہ" میں انہوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے

تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی ۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا ۔ جب ایک نئی نبوت ـــــــ بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ـــــــ کا دعویٰ کیا گیا ۔ اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا ۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی ۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلعم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا ۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے ۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپکو نہیں جھٹلا سکتے ۔

(جب علامہ صاحب سے الہام اور مصلحین کے آنے کے امکانات کے متعلق پوچھا گیا، تو فرمایا:)

اس سوال کا جواب "تشکیل نو" کے حوالہ سے بہتر دیا جاسکے گا ۔ جہاں صفحہ ۱۲۰ - ۱۲۱ پر میں نے لکھا ہے :-

> "ختم نبوت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل جذبات (emotion) کی قائم مقام ہو جائے ۔ یہ چیز نہ ممکن ہے نہ مستحسن ۔ اس عقیدہ کی عقلی افادیت اتنی ہے کہ اس سے باطنی واردات کو آزاد تنقیدی رنگ ملتا ہے ۔ کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا ۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے ۔ جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے ۔ اور اس خیال سے انسان کے اندرونی

تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے "لا الٰہ" فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کا لباس اتارتا ہے۔ اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی رُوح پیدا کرتا ہے۔ باطنی واردات، خواہ وہ کتنی غیر فطری اور غیر معمولی ہو، مسلمان کے لئے بالکل فطری تجربہ ہے۔ جو دُوسرے تجربات کی طرح تنقید کی زد میں آتا ہے۔ اور یہ چیز رسُول کریمؐ کے رویّہ سے اور بھی روشن ہو جاتی ہے، جو انہوں نے ابن سید کی نفسیاتی واردات کے لئے اختیار فرمایا۔ اسلام میں تصوّف کا مقصد اپنی باطنی واردات کو منظم کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابن خلدون ہی ایک ایسا شخص گذرا ہے۔ جس نے اسے اصُولی طریقے پر جانچا۔"

پہلے فقرہ سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی معانی میں اولیاء یا ان جیسی صفات کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ مرزا صاحب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ جب تک عالم انسانیت کی روحانی اہلیتیں برداشت کر سکتی ہیں۔ ایسے لوگ تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوں گے تاکہ وہ انسانی زندگی کی بہتر اقدار کا پتہ دے سکیں۔ اس کے خلاف قیاس کرنا تو انسانی تجربہ کو جھٹلانا ہوگا۔ فرق محض اس قدر ہے کہ اب ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ اور باتوں کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہی ہے کہ روحانی زندگی میں، جسکے انکار کی سزا جہنم ہے، ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔

(جب ایک پارسی مسٹر دینشا کے ایک خط کے متعلق جو "اسٹیٹسمین"

میں شائع ہوا تھا۔ علامہ صاحب سے پوچھا گیا، تو فرمایا:)

مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ سوائے اس کے کہ مجھے ان کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے۔ یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر (Spengler) نے اسلام پر موبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک موبدانہ مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب "تشکیل نو" میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس موبدانہ خول کو دور کر دوں۔ اور مجھے امید ہے کہ اسی سلسلے میں میں اپنی کتاب "قرآنی تعلیم کا مقدمہ"[1] میں مزید کام کر سکونگا" موبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات، فلسفہ، اور تصوف کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ بہت سا مواد ایسا موجود ہے۔ جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوف کے چند اسکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں، اس موبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے۔ میں موبد تمدن کو انسانی تمدن کے بیشمار مظاہرات میں سے ایک مظاہرہ سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو برے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس بھی حکومت کا تصور تھا، فلسفیانہ مباحث تھے۔ حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی۔ لیکن جب کسی تمدن پر زوال آتا ہے۔ تو اس کے فلسفیانہ مباحث، تصورات، اور دینی واردات کے اشکال میں انجماد اور سکون آجاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو موبد تمدن پر یہی حالت طاری تھی۔ اور تمدنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ اسلام نے اس تمدن کے خلاف احتجاج کیا۔ خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ

[1] جہاں تک مولف کو علم ہے یہ کتاب مرتب نہیں ہوئی۔

محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لئے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا۔
لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل ڈالا اور اس کی اصل
روح اور مقاصد کو ابھرنے کا کبھی موقع نہ دیا۔

(۴۲) "اسٹیٹسمین" کو ایک خط

(اخبار اسٹیٹسمین نے اقبال کا بیان "قادیانی اور جمہور مسلمان" شائع
کیا اور اس پر اپنے اداریہ میں تنقید بھی کی۔ مندرجہ ذیل خط اس کے جواب
میں لکھا گیا اور ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں طبع ہوا:)

میرے بیان مطبوعہ ۱۴ مئی پر آپ نے تنقیدی اداریہ لکھا؛ اس کے
لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اٹھایا
ہے، وہ فی الواقعہ بہت اہم ہے۔ اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اس
سوال کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اسے نظر
انداز کر دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش
نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان
کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں
کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے۔ اور اس کا
انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں۔ اور مجھے اس احساس میں حکومت
کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ ۱۹۱۹ء تک آئینی
طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد

علیحدہ جماعت تسلیم کر لئے گئے۔ حالانکہ انہوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں۔

اب چونکہ آپ نے یہ سوال پیدا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس مسئلہ کے متعلق جو برطانوی اور مسلم دونوں کے زاویۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے۔ چند معروضات پیش کروں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کروں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے، تو میں اسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ:

اوّلاً: اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کے حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان، اور رسول کریم کی ختم رسالت پر ایمان۔ در اصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے۔ جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ ملّت اسلامیہ شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور رسول کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن انہیں ملّت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور رسول کریمؐ کی ختم نبوّت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں۔ اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف

سے ظاہر ہوا۔ لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں۔ یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ اُن کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو، تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

ثانیاً: ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں اُن کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ تمام دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ ہندوؤں سے۔ کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔

ثالثاً: اس امر کو سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی

اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو ۵۶،۰۰۰ (چھپن ہزار) ہے انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی۔ اور اس لئے انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا، اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لئے کیوں انتظار کر رہی ہے؟

(۴) پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب[۱]

ماڈرن ریویو، کلکتہ، میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضامین شائع

۱۔ مترجمہ میر حسن الدین صاحب، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ)

ہونے کے بعد مجھے اکثر مسلمانوں نے، جو مختلف مذہبی و سیاسی مسلک رکھتے ہیں، متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی خواہش ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے طرزِ عمل کی مزید توضیح کروں۔ اور اس طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کروں۔ بعض یہ دریافت کرتے ہیں کہ میں احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتا ہوں۔ اس بیان میں میں ان مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہوں، جن کو میں بالکل جائز تصور کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد ان سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اٹھائے ہیں۔ بہرحال مجھے اندیشہ ہے کہ اس بیان کا ایک حصہ پنڈت جی کے لئے دلچسپ نہ ہوگا۔ لہذا ان کا وقت بچانے کے لئے میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ ایسے حصوں کو نظر انداز کردیں۔

میرے لئے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے بلکہ ساری دنیا کے، ایک عظیم الشان مسئلے سے جو دلچسپی ہے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں، جنہوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بےچینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بےچینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکن ردِعمل کے مدِنظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہئیے کہ اس وقت قلبِ اسلام میں جو چیز ہیجان برپا کر رہی ہے، اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بہرحال میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا

نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں، میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اُس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ مَیں اس خیال کی طرف مائل ہُوں کہ مَیں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصُولوں کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اُس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجُوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جنکی سیاسی تصوریت نے احساس حقائق کو کچل ڈالا ہے، اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خود مختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لئے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہئیے۔ حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائندار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائے گی اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہوگا؟ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہُوئے

ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے
ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبرِ عرب کی امت سے ہندوستانی
پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش
کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں،
جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر
ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے
جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیتی
ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

بہرکیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری
رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرزِ عمل
کی توضیح چاہتے ہیں، ان کے استفادہ کے لئے میں ڈیورنٹ کی کتاب
"افسانۂ فلسفہ" کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے قارئین کو واضح طور پر
معلوم ہو جائے گا کہ قادیانیت میں امرِ متنقیح طلب کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے
فلسفیٔ اعظم اسپائنوزا کے جماعت بدر کئے جانے سے متعلق یہودی نقطہ
نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں
کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب اسپائنوزا اور بانیٔ احمدیت
میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل و سیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے
مابین بعدِ عظیم ہے "خدامست" اسپائنوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ
کسی جدید تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے۔ یہودیت سے

خارج ہے۔ اسپائنوزا کے جماعت بدر کئے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی کی عبارت یہودیوں کے طرز عمل پر اس قدر منطبق نہیں ہوتی جس قدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرز عمل پر ہوتی ہے۔ یہ عبارت حسب ذیل ہے:۔

"علاوہ بریں اکابر یہود کا خیال تھا کہ اسٹرڈم میں ان کی جو چھوٹی سی جماعت تھی ان کو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ مذہبی وحدت ہے اور یہودیوں کی جماعت کو جو دنیا میں بکھری ہوئی ہے، برقرار رکھنے اور ان میں اتفاق پیدا کرنے کا آخری ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر ان کی اپنی کوئی سلطنت، کوئی ملکی قانون اور دنیاوی قوت و طاقت کے ادارے ہوتے جن کے ذریعہ وہ اندرونی استحکام اور بیرونی استحکام حاصل کر سکتے تو وہ زیادہ روادار ہوتے۔ لیکن ان کا مذہب ان کے لئے ایمان بھی تھا اور حب الوطنی بھی۔ ان کا معبد ان کی عبادت اور مذہبی رسوم کے علاوہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز تھا۔ ان حالات کے ماتحت انہوں نے الحاد کو غداری اور رواداری کو خودکشی تصور کیا۔"

اسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپائنوزا کو ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح مسلمانان ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریک قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے۔ مسلمانان ہند کی حیات ملی کے

لیے اسپائنوزا کی اس مابعد الطبعیات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی
حیات ملی کے لیے تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانان ہندان حالات کی مخصوص
نوعیت کو جبلی طور پر محسوس کرتے ہیں جن میں کہ وہ ہندوستان میں گھرے
ہوئے ہیں اور دوسرے ممالک کے مقابلہ میں انتشار انگیز قوتوں کا قدرتی
طور پر زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ ایک اوسط مسلمان کا یہ جبلی ادراک میری
رائے میں بالکل صحیح ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس احساس کی بنیاد
مسلمانان ہند کی ضمیر کی گہرائیوں میں ہے۔ اس قسم کے معاملات میں
جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بےحد
غیر محتاط ہیں۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل نہیں سمجھتے۔
رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نقاط نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن
کہتا ہے کہ "ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب
یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مؤرخ کی ہے جس کے نزدیک تمام
مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک
تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے
جو ہر قسم کے تفکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و
عمل سے بےتعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض
کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر
کی جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے۔ یہ بالکل صاف بات ہے کہ اس قسم
کی رواداری اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے

اس شخص کے رُوحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہُوئے، دُوسرے مذاہب کو رُوا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ خود اس کا مذہب ابتلائی ہے اس وجہ سے وہ بآسانی دوسرے مذاہب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے شاعرِ اعظم امیر خسرو نے ایک بُت پرست کے قِصہ میں اس قسم کی رواداری کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس کی بتوں سے لیے اندازہ محبّت کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنے مسلمان قارئین کو یوں مخاطب کرتا ہے :-

اے کہ زبُت طعنہ بہ ہندی بُری
ہم زوے آموز پرستش گری

خدا کا ایک سچا پرستار ہی عبادت و پرستش کی قدر و قیمت کو محسوس کر سکتا ہے، خواہ اس پرستش کا تعلّق ایسے ارباب سے ہو جن پر وہ اعتقاد نہیں رکھتا۔ رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس طرزِ عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔

جب کسی جماعت کے افراد جبلی طور پر یا کسی عقلی دلیل کی بنا پر یہ محسوس کرتے ہوں کہ اس جماعت کی اجتماعی زندگی خطرہ میں ہے جس کے یہ رکن ہیں تو اُن کے مدافعانہ طرزِ عمل کو حیاتیاتی معیار پر جانچنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہر فکر و عمل کی تحقیق اس لحاظ سے کرنی چاہیئے کہ اس میں حیات افروزی کس قدر ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو ملحد قرار دیا گیا ہو، کسی فرد یا جماعت کا رویہ اخلاقاً صائب ہے یا غیر صائب۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیات افروز ہے یا حیات کُش۔ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوئی ہے وہ محکمۂ احتساب[1] کے قیام کو مستلزم ہے۔ تاریخ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن تاریخ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے کہ حیاتِ اسلامی کے گزشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمۂ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی ممانعت کرتا ہے "دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش نہ کرو اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ"۔ پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطن کے مذہبی تشدد سے تنگ آ کر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقلی

---

[1] قرونِ وسطیٰ میں Inquisition کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا جو لوگوں کے عقائد مذہبی کی تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ برونو وغیرہ ایسے علمائے سائنس کو اس محکمہ نے نذرِ آتش کیا۔

عمارت قائم ہے وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں ایسا الحاد ناممکن ہے
جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب
کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظام اجتماعی
خطرہ میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد
کرے گی۔ لیکن ایسی صورت میں ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی
ہوگا۔ نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر۔ میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا
ہوں کہ پنڈت جی ایسا شخص جس کی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت
میں ہوئی ہے جس کی سرحدیں متعین نہیں ہیں۔ اور جس میں اندرونی استحکام
بھی مفقود ہے۔ اس امر کا بمشکل اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک مذہبی جماعت
ایسے محکم احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ جو حکومت کی جانب سے
عوام کے عقائد کی تنقیحات کے لئے قائم کیا جاتا ہے یہ بات کارڈنل نیومن
کی اس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے جو پنڈت جی پیش کر کے حیرت
کرتے ہیں کہ میں کارڈنل کے اصولوں کو کس حد تک اسلام پر قابل اطلاق
سمجھتا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی اندرونی ہیئت
ترکیبی اور کیتھولک مسیحیت میں اختلاف عظیم ہے۔ کیتھولک مسیحیت کی
پیچیدگی، اس کی فوق العقلی نوعیت اور تکلمی عقائد کی کثرت نے، جیسا کہ
تاریخ مسیحیت سے ظاہر ہوتا ہے، الحادات و بدعات کے لئے راستہ کھول
دیا ہے۔ اسلام کا سیدھا سادہ مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے
اور محمد علیہم اس سلسلہ انبیاء کے آخری نبی ہیں جو وقتاً فوقتاً ہر قوم اور ہر

زمانے میں اس غرض سے مبعوث ہوئے تھے کہ نوع انسان کی رہنمائی
صحیح طرز زندگی کی طرف کریں۔ جیسا کہ بعض عیسائی مصنفین خیال کرتے ہیں
کہ کسی متکلمی عقیدے کی تعریف اسی طرح کی جانی چاہیئے کہ وہ ایک فوق العقلی
قضیہ ہے۔ اور اس کو مذہبی استحکام کی خاطر اور اس کا مابعد الطبعی مفہوم سمجھے
بغیر مان لینا چاہیئے تو اس لحاظ سے اسلام کے ان دو سادہ قضایا کو متکلمی عقیدے
سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کی تائید نوع انسان کے تجربہ
سے ہوتی ہے۔ اور ان کی عقلی توجیہ بخوبی کی جا سکتی ہے۔ ایسے الحاد کا سوال
جہاں یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اس کا مرتکب دائرہ مذہب میں ہے یا اس
سے خارج ہے ایسی مذہبی جماعت میں جو ایسے سادہ قضایا پر مبنی ہو، اس
صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ ملحد ان قضایا میں سے کسی ایک یا دونوں سے انکار کر دے۔
تاریخ اسلام میں ایسا واقعہ شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور ہونا بھی یہی
چاہیئے کیونکہ جب اس قسم کی کوئی بغاوت پیدا ہوتی ہے تو ایک اوسط مسلمان
کا احساس قدرتی طور پر شدید ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران
کا احساس بہائیوں کے خلاف اس قدر تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانان
ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات کے فروعی مسائل میں اختلاف
کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ دینیات کے فروعی
مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں ملحد
کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آجکل
کے تعلیم یافتہ مسلمان، جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل

ناواقف ہیں، ملّت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصوّر
کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصوّر ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے
ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد
کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو مستحکم کرنے کا
ذریعہ بن گیا ہے۔ پروفیسر گرائنیخ کہتے ہیں کہ "جب ہم فقہ اسلامی کے نشوو
نما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو
ہر زمانے کے علما خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت میں اس
حد تک کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور دوسری
طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کے ساتھ اپنے پیشرؤوں کے
اختلافات رائج کرتے ہیں" اسلامی دینیات کا متعلم جانتا ہے کہ بعض اوقات
اس قسم کے الحاد کو اصطلاحی زبان میں کفر دون کفر سے تعبیر کرتے ہیں یعنی
ایسا کفر جس میں مرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ تسلیم
کرنا پڑتا ہے کہ ملاؤں کے ذریعے جن کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کے ہر
اختلاف کو قطعی سمجھتا ہے اور اختلاف میں اتحاد کو دیکھ نہیں سکتا، خفیف سا
الحاد فتنۂ عظیم کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ کا انسداد اس طرح ہو سکتا
ہے کہ ہم مدارس دینیات کے طلبا کے سامنے اسلام کی ابتدائی روح کا
واضح ترین تصوّر پیش کریں۔ اور ان کو یہ بتلائیں کہ منطقی تضاد کے دینیاتی
تفکر میں اصول حرکت کا کام کرتا ہے۔ یہ سوال کہ الحاد کبیرہ کس کو کہتے
ہیں، اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم مذہب اسلام

کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیم میں یہ
سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تحریک احمدیت دو
جماعتوں میں منقسم ہے جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم
ہیں۔ اول الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے۔ آخر الذکر نے
اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔
بہرحال یہ سوال کہ آیا بانی احمدیت ایک نبی تھا اور اس کی تعلیم سے انکار
کرنا "الحاد کبیرہ" کو مستلزم ہے ان دونوں جماعتوں میں متنازعہ فیہ ہے
احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد
کے لئے غیر ضروری ہے۔ میرا یقین ہے (جس کی وجوہ میں آگے چل
کر بیان کروں گا) کہ ایک ایسے نبی کا تصور جس کے انکار کرنے سے منکر خارج
اسلام ہو جاتا ہے، احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے اور لاہوری جماعت
کے امام کے مقابلہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا تحریک احمدیت کی
روح سے بالکل قریب ہیں۔

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی
اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ محمد صلعم کے بعد جنہوں
نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسان کی گہرائیوں سے
ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے، کسی اور انسانی ہستی
کے آگے روحانی حیثیت سے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے
اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام

کہتے ہیں۔ مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلعم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان
ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ
کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک
احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار
دیتے ہیں۔ خود بانی احمدیت کا استدلال جو قرون وسطیٰ کے متکلمین کے
لئے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر
اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں
کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی۔ خود اپنی نبوت کو پیش
کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ آیا محمد صلعم کی روحانیت
ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی
میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ "محمد صلعم آخری نبی نہیں میں
آخری نبی ہوں" اس امر کے سمجھنے کی بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوع
انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر
رکھتا ہے، بانی احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ
محمد صلعم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ خود محمد صلعم کی نبوت
کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے
دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے
ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے
بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار

کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ میں پیغمبر اسلام کا "بروز" ہوں۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا دراصل محمد صلعم کا خاتم النبیین ہونا ہے۔ پس یہ نقطہ نظر پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کو مسترد نہیں کرتا۔ اپنی ختم نبوت کو پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کے مماثل قرار دے کر بانی احمدیت نے ختم نبوت کے تصور کے زمانی مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال یہ ایک بدیہی بات ہے کہ بروز کا لفظا مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔ کیونکہ بروز ہمیشہ اس شے سے الگ ہوتا ہے جس کا یہ بروز ہوتا ہے۔ صرف اوتار کے معنوں میں بروز اور اس شے میں عینیت پائی جاتی ہے۔ پس اگر ہم بروز سے "روحانی صفات کی مشابہت" مراد لیں تو یہ دلیل بے اثر رہتی ہے۔ اگر اس کے برعکس اس لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل شے کا اوتار مراد لیں تو یہ دلیل بظاہر قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس خیال کا موجد مجوسی بھیس میں نظر آتا ہے۔

ہسپانیہ کے برگزیدہ صوفی محی الدین ابن العربی کی سند پر یہ مزید دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لئے اپنے روحانی ارتقا کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعور نبوت سے مختص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی کا یہ خیال نفسیاتی نقطہ نظر سے درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو صحیح فرض کر لیا جائے تو تب

بھی قادیانی استدلال شیخ کے موقف کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ ایسے تجربہ کو ذاتی کمال تصور کرتے ہیں جس کی بنا پر کوئی ولی یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ جو شخص اس پر (یعنی ولی پر) اعتقاد نہیں رکھتا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ملک میں ایک سے زیادہ اولیا موجود ہو سکتے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ نفسیاتی نقطہ نظر سے ایک ولی کا شعور نبوت تک پہنچنا اگرچہ ممکن ہے، تاہم اس کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اس کو کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے اور نہ یہ استحقاق عطا کرتا ہے کہ وہ اس نئی تنظیم کو پیروان محمد صلعم کے ایمان یا کفر کا معیار قرار دے۔

اس صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کر کے "فتوحات" کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی محمد صلعم کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آجاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے، شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کی ختم نبوت سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانان عالم کو ایسے غداران اسلام سے متنبہ کر دیتے۔

اب احمدیت کی رُوح پر غور کرنا ہے۔ اس کے ماخذ اور اس امر کی
بحث کہ قبل اسلام مجوسی تصورات نے اسلامی تصوف کے ذریعہ بانی احمدیت
کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا۔ مذہب مقابلہ کے نقطۂ نظر سے بے حد دلچسپ
ہوگی۔ لیکن میرے لئے اس بحث کو اٹھانا ممکن نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے
کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرون وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے نقاب
میں پوشیدہ ہے علمائے ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا
اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ بہرحال میرا خیال ہے
کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ موزوں نہیں تھا۔ اس وجہ
سے علما کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بانی احمدیت کے الہامات کی اگر
دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا موثر طریقہ ہوگا جس کے ذریعہ سے
ہم اسکی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں میں اس امر
کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانی احمدیت کے الہامات
کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس میں نفسیاتی تحقیق کے لئے متنوع اور مختلف
مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانی احمدیت کی سیرت اور شخصیت
کی کنجی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا
سنجیدگی سے مطالعہ کریگا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ
سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑیگا جن کی تشریح یہاں نہیں کی جاسکتی) اور اپنے
مطالعہ کو بانی احمدیت اور اس کے ہمعصر غیر مسلم صوفیا جیسے رام کرشنا بنگالی
کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی

حیرت ہو گی۔ جس کی بنا پر بانی احمدیت نبوت کا دعویدار رہے ہے

عام آدمی کے نقطہ نظر سے ایک اور مؤثر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ ۱۷۹۹ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء بے حد اہم ہے۔ اسی سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اس کی شکست کے ساتھ مسلمانوں کو ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو امید تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی سال جنگ نوارینو وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑہ تباہ ہو گیا۔ جو لوگ سرنگا پٹم گئے ہیں ان کو ٹیپو کے مقبرے پر یہ تاریخ وفات کندہ نظر آئی ہو گی۔

"ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہو گئی"

ان الفاظ کے مصنف نے پیشین گوئی کی تھی۔ پس ۱۷۹۹ء میں ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن جس طرح کہ دنیا میں جرمنی کی شکست کے بعد جدید جرمن قوم کا نشوونما ہوا، کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح ۱۷۹۹ء میں اسلام کی سیاسی شکست کے بعد جدید اسلام اور اس کے مسائل معرض ظہور میں آئے۔ اس امر پر میں آگے چل کر بحث کروں گا۔ فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟

مسلمانان ہند اور وہ مسلمان جو ترکی کی سلطنت سے باہر ہیں ترکی کی خلافت

سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں
نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت "خدا، رسول اور تم میں سے
اولی الامر کی اطاعت کرو"[1] میں الفاظ "تم میں سے" کا کیا مفہوم ہے۔ احادیث سے
آمد مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یا اور اسی
قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف
مسلمانان ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اس وقت
اسلامی دنیا میں سرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی ان سوالات سے
گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند
کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔
مسلمان ارباب سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں علماء کے
ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ دینیاتی استدلال
کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورت حال کے مناسب ہو لیکن محض منطق
سے ایسے عقائد پر فتح پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے مسلمانان ہند کے قلوب
پر حکمران تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنا پر آگے بڑھ
سکتی ہے یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر کے ذریعہ ہر دو صورتوں میں استقلال
عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت
شدید ہے صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند
ہے۔ راسخ عقائد کو موثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرۂ صدر سوالات میں جو دینیاتی
نظریات مضمر ہیں ان کی نئی تفسیر کرنے کے لئے جو سیاسی اعتبار سے موزوں

[1] اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

ہوئے ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے اول درجہ کے کافر ہیں اور انکا ٹھکانا نار جہنم ہے۔ جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشا کو سمجھا ہے، احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعت مسیح گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے۔ اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتدائی مدارج ہیں اس تصور نبوت کو جو ایسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جن کو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں۔ ایسے ممالک میں جو ابھی تمدن کی ابتدائی منازل میں ہیں منطق سے زیادہ سند کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کافی جہالت اور زود اعتقادی موجود ہو اور کوئی شخص اس قدر بے باک ہو کہ حامل الہام ہونے کا دعویٰ کرے جس سے انکار کرنے والا ہمیشہ کے لئے گرفتار لعنت ہو جاتا ہے تو ایک محکوم اسلامی ملک میں ایک سیاسی دینیات کو وجود میں لانا اور ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے، جس کا مسلک سیاسی محکومیت ہو۔ پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں جس کو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ طنز آمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بنا پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایان شان نہیں کہ وہ مسلمانان ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانان ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آلام و مصائب کے لئے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

پس قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام کے رخسار پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے وہ مسلمانان ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں بانی احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بانی احمدیت اور اس کے رفقاء نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانی احمدیت نے ایک آواز سنی۔ لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے یا لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی، اس تحریک کی

نوعیت پر منحصر ہونا چاہیئے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات
پر بھی جو اُس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کئے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں
کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی تاریخ حیات بتلاتی ہے کہ
جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام
کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفہ، اولیاء، مدبرین اس سے
متاثر ہو جاتے ہیں اور مبلغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ جاتی ہے جس کا
مقصد واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفرین قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے
ہر اس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے۔ یہ مبلغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو
امید کے درخشاں لباس میں چھپا دیتے ہیں، کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اس طرح ان
لوگوں کی روحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں جو ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قوت ارادی
پر ذرا غور کرو جنہیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول
کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامہ
میں حصہ لیا ہے زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی
بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اس میں نہ
وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام
کے لئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور
بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان
نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ
میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار

ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعت نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے۔ اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقین کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان کے حالات ایک نیا رخ اختیار کر چکے ہیں۔ جمہوریت کی نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے وہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی۔ انہیں یقین ہو جائے گا کہ ان کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سود ہیں۔

اسلام قرون وسطیٰ کے اس تصوف کی تجدید کو کبھی روا نہ رکھے گا۔ جس نے اپنے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف ان کا رخ پھیر دیا۔ اس تصوف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اور سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ جدید اسلام اس تجربہ کو دہرا نہیں سکتا۔ اور نہ وہ پنجاب کے اس تجربے کے اعادے کو روا رکھ سکتا ہے جس نے مسلمانوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مسائل میں الجھائے رکھا جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کوئی ولی یا پیغمبر اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

پنڈت جی کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام یا انیسویں صدی کے اسلام کی مذہبی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ انہوں نے شاید میری تحریرات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے جن میں ان کے سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ میرے لئے یہاں ان تمام خیالات کا اعادہ کرنا ممکن نہیں جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کو پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں جس کے بغیر دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حال کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ ترکی اور جدید اسلام کے متعلق سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں اس لٹریچر کے بیشتر حصہ کا مطالعہ کر چکا ہوں اور غالباً پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کا مطالعہ کر چکے ہونگے۔ بہرحال میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے ایک مصنف نے بھی ان نتائج یا ان اسباب کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھا جو ان نتائج کا باعث ہیں لہٰذا مسلمانوں کے تفکر کے خصوصی رجحانات کو جو انیسویں صدی کے ایشیا میں پائے جاتے ہیں اجمالی طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ۱۶۹۹ء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بہرحال اسلام کی اندرونی قوت کا اس واقعہ سے بڑھ کر کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دنیا میں اس کا کیا موقف ہے۔ انیسویں صدی میں سر سید احمد خاں ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں، اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ یہ حضرات غالباً محمد ابن الوہاب سے متاثر ہوئے تھے۔ جنکی ولادت سنہ ۱۷۰۳ء

میں بمقام نجد ہوئی تھی۔ اور جو اس نام نہاد وہابی تحریک کے بانی تھے جس کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ عصر جدید کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دور کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے نیز روس میں مفتی عالم جان نے، مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سر سید احمد خاں کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس رُوح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردّ عمل کیا۔

مسلمانان ہند کی انتہائی قدامت پرستی جو زندگی کے حقائق سے دُور ہو گئی تھی سید احمد خاں کے مذہبی نقطہ نظر کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکی۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جو ابھی تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہے اور جہاں دیگر اقطاع ہند کے مقابلہ میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے، سر سید کی تحریک کے خلاف احمدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوّف کی عجیب و غریب آمیزش تھی اور اس میں کسی فرد کا روحانی احیاء قدیم اسلامی تصوّف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ "مسیح موعود" کی آمد کو پیش کر کے عوام کی کیفیت کو تشفی انتظار دی جاتی تھی۔ اس "مسیح موعود" کا فرض

یہ نہیں تھا کہ فرد کو موجودہ پستی سے نجات دلائے بلکہ اس کا کام یہ تعلیم دینا ہے
کہ لوگ اپنی روح کو غلامانہ طور پر پستی اور انحطاط کے سپرد کر دیں۔ اس ردِ
عمل ہی کے اندر ایک نازک تضاد مضمر ہے۔ یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو
برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط
کرنا چاہتا ہے۔

مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت
کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے
زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔
جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی
فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک
اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران،
مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل
القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد
بن گئے جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔
انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت۔ اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنہیں
ان کا قرب حاصل ہوا چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی
نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانہ کے کسی شخص نے
روحِ اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انہوں نے کی تھی۔
ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ

اس کی انتہا کہاں ہوگی۔

بہرحال اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے دنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

۱۔ ملائیت۔ علما ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔ لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کے لئے حوصلہ افزا تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی علما کے اس جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جا سکے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوف۔ مسلم اقوام پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے

پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت۔ مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی۔ اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

مسلمانوں کے فکر و تاثر کی دنیا میں ان مصلحین نے جو انقلاب پیدا کیا ہے اس کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال ایک چیز بہت واضح ہے۔ ان مصلحین نے زاغلول پاشا، مصطفےٰ کمال، اور رضا شاہ ایسی ہستیوں کی آمد کے لئے راستہ طیار کر دیا۔ ان مصلحین نے تعبیر و تفسیر، توجیہہ و توضیح کی لیکن جو افراد ان کے بعد آئے اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے تاہم اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے جرأت کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے اور زندگی کی نئی ضروریات کا جو تقاضا تھا اسکو جبر و قوت سے پورا کیا۔ ایسے لوگوں سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں لیکن تاریخ اقوام بتلاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کر دیتی ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کیلئے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا

ضروری ہے کہ سر سید احمد خاں۔ سید جمال الدین افغانی اور اُن کے سینکڑوں شاگرد جو اسلامی ممالک میں تھے، مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے قدیم مکتب کے ملاؤں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور اس عقلی و روحانی فضا میں سانس لیا تھا جس کی وہ از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جدید خیالات کا اثر ضرور پڑا ہے لیکن جس تاریخ کا اجمالی طور پر اوپر ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب ظہور پذیر ہوا اور جو جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک بھی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ بالکل اندرونی قوتوں کا آفریدہ تھا۔ جدید دنیائے اسلام کو جو شخص سطحی نظر سے دیکھتا ہے وہی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کا موجودہ انقلاب محض بیرونی قوتوں کا رہینِ منت ہے۔

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص کر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی، مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ایک خالص فقہی سوال ہے۔ اور اس کا فیصلہ اسلام کی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے یعنی توحید اور ختم نبوت تو اس کو ایک راسخ العقیدہ ملا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیات قرآنی کی تاویلات میں وہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالباً پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ مفروضہ

یا حقیقی اصطلاحات ہیں۔ جو اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لیے
ان کا جائزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادی نقطہ نظر کا نشوونما اسلام کے
منافی ہے؟ مسلمانوں میں ترک دنیا کا بہت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے
لئے اب وقت آگیا ہے کہ وہ حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مادیت مذہب
کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے لیکن ملا اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کے
لیے ایک موثر حربہ ہے جو عموماً لوگوں کو اس غرض سے گرفتار حیرت کر دیتے ہیں
کہ ان کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسلام کی روح مادہ کے
قرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا دنیا میں جو حصہ ہے اس کو
نہ بھولو۔ ایک غیر مسلم کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں
دنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے۔ اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی
تحقق ذات کی ایک صورت ہے۔ کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج
اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں۔
اور بحیثیت ایک معاشرت کے اس کی نہ کوئی مخصوص زبان ہے اور نہ کوئی
مخصوص لباس۔ قرآن کا ترکی زبان میں پڑھا جانا تاریخ اسلام میں کوئی نئی
بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر
کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں کیونکہ عربی زبان و ادب کا منتظم اچھی طرح جانتا
ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے تو وہ عربی ہے۔ بہرحال
اب یہ اطلاعیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن کا پڑھنا ترک کر دیا
ہے۔ تو کیا کثرت ازدواج کی ممانعت یا علما پر لائسنس حاصل کرنے کی قید

منافی اسلام ہے؟ فقہ اسلام کی رُوح سے ایک اسلامی ریاست کا امیر
مجاز ہے کہ شرعی "اجازتوں" کو منسوخ کر دے بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے
کہ یہ "اجازتیں" معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ رہا علماء کا
لائسنس حاصل کرنا، آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں
نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملّا کی
ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک
نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔
رسول کریم صلعم کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رُو سے وعظ کرنے کا
حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اُس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو
حاصل ہے۔ خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں تاہم یہ
ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم
ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے۔ سوئٹزر قانون اور
اس کے قواعد ترکہ کو اختیار کر لینا ضرور ایک سنگین غلطی ہے جو جوشِ اصلاح کی
کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے اور ایک ایسی قوم میں جو سرعت کے ساتھ
آگے بڑھنا چاہتی ہے ایک حد تک قابل معافی ہے۔ پیشوایانِ مذہب کے
شدید استبداد سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات
ایسی راہ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے جس کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں
ہوتا۔ ترکی اور نیز تمام دنیائے اسلام کو اسلامی قانون وراثت کے
ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جن کو فان کریمر "فقہ اسلام

کی بیحد اپچی شاخ" سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخ خلافت یا مذہب و سلطنت کی علیحدگی منافی اسلام ہے؟ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ میں جو بنوامیہ کے زمانے سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی اسلام کی روح اتاترک کے ذریعہ کارفرما رہی ہے۔ مسئلہ خلافت میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لئے ہمیں ابن خلدون کی رہنمائی حاصل کرنی پڑے گی، جو اسلام کا ایک جلیل القدر فلسفی، مؤرخ اور تاریخ جدید کا ابوالآبا گزرا ہے۔ میں یہاں اپنی کتاب "اسلامی تفکر کی تشکیل جدید" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور "مقدمہ تاریخ" میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین ممتاز نقاط نظر پیش کرتا ہے۔ (۱) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے اسی لئے اس کا قیام ناگزیر ہے (۲) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے۔ (۳) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں۔ آخرالذکر خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہورین تھے۔ ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے خیال کی طرف مائل ہے۔ یعنی معتزلہ کے اس خیال کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہم کو اپنے سیاسی تفکر میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے مدد لینی چاہیئے۔ جو بلا شک و شبہ اس واقعہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا تفکر و تخیل عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر رہا۔ یہ تخیل اس وقت قابل عمل تھا جب کہ

اسلامی ریاست برقرار تھی۔ اس ریاست کے انتشار کے بعد کئی آزاد سلطنتیں وجود میں آگئی ہیں۔ اب یہ تخیل بے اثر ہو گیا ہے اور اسلام کی تنظیم جدید میں ایک زندگی بخش عنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہو سکتا۔

مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا تصور بھی اسلام کے لئے غیر مانوس نہیں ہے امام کی "غلیبت کبریٰ" کا نظریہ ایک مفہوم میں ایک عرصہ پہلے شیعی ایران میں اس علیحدگی کو روبہ عمل لا چکا ہے۔ ریاست کے مذہبی و سیاسی وظائف کی تقسیم کے اسلامی تصور کو کلیسا اور سلطنت کے مغربی تصور سے مخلوط نہ کرنا چاہیئے۔ اول الذکر تو محض وظائف کی ایک قسم ہے جیسا کہ اسلامی ریاست میں شیخ الاسلام اور وزرا کے عہدوں کے تدریجی قیام سے واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آخر الذکر روح اور مادہ کی مابعد الطبعی ثنویت پر مبنی ہے۔ مسیحیت کا آغاز ایک نظام رہبانیت سے ہوتا ہے۔ جسے دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلام ابتدا ہی سے ایک نظام معاشری رہا ہے جس کے قوانین بالطبع معاشری ہیں۔ اگرچہ ان کا ماخذ الہامی ہے۔ مابعد الطبعی ثنویت نے جس پر مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا مغربی تصور مبنی ہے مغربی اقوام میں تلخ ثمرات پیدا کیئے۔ کئی سال ہوئے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا "اگر مسیح شکاگو آئیں" اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے:

"مسٹر سٹیڈ کی کتاب سے ہمیں جو سبق حاصل کرنا ہے یہ ہے کہ اس

If Christ Came To Chicago

وقت نوع انسان جن برائیوں میں مبتلا ہے وہ ایسی برائیاں ہیں جن کا ازالہ صرف مذہبی تاثرات ہی کر سکتے ہیں - ان برائیوں کا ازالہ ایک بڑی حد تک ریاست کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں دب گئی ہے - یہ مشینیں ان برائیوں کا ازالہ کرنے کے لئے نہ صرف تیار نہیں بلکہ وہ اس قابل بھی نہیں ہے - پس کروڑہا انسانوں کو تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے بچانے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ شہریوں میں اپنے اجتماعی فرائض کا مذہبی احساس پیدا کیا جائے"

مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے نہ کہ عقائد کی - اسلامی ممالک میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کی قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے - جو صدیوں سے اسلامی روحانیت کے تحت پرورش و نمو پاتا رہا ہے - تجربہ خود بتلا دے گا کہ یہ تخیل جدید ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے - ہم صرف یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ ان برائیوں کا باعث نہ ہوگا جو یورپ اور امریکہ میں پیدا ہو گئی ہیں -

متذکرۃ الصدر اصلاحات پر میں نے جو اجمالی بحث کی ہے اس میں میرا روئے سخن پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا - پنڈت جی نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ترکوں اور ایرانیوں

نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ تاریخ کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا
ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب کہ وحدتِ انسانی کے قدیم اصول جیسے خونی رشتہ
اور ملوکیت ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ پس اسلام نے وحدتِ انسانی کا اصول
گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ روحِ انسانی میں دریافت کیا۔ نوعِ انسان
کو اسلام کا اجتماعی پیغام یہ ہے کہ "نسل کے قیود سے آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں
سے ہلاک ہو جاؤ"۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو
بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نقطۂ نظر
پیدا کر دیتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری
قائم کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو اہم تمدنی کارنامے ایک ہزار سال میں
انجام دیئے وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیئے۔
یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے
اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم یہ نہیں
کہا جا سکتا کہ اسلام نسل کا سرے سے مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا
ہے کہ اسلام نے معاشری اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا کہ بتدریج
نسلی عصبیت کو مٹایا جائے اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں تصادم
کا کم سے کم امکان ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے "ہم نے تم کو قبائل میں اس لئے
پیدا کیا کہ تم پہچانے جا سکو لیکن تم میں سے وہی شخص خدا کی نظر میں بہترین
ہے جس کی زندگی پاک ہے"۔ اگر اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ مسئلہ نسل
کس قدر زبردست ہے اور نوعِ انسان سے نسلی امتیازات مٹانے کے لئے

کس قدر وقت درکار ہے۔ تو مسئلہ نسل کے متعلق صرف اسلام ہی کا نقطہ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عنصر بننے بغیر نسلی امتیازات پر فتح پانا) معقول اور قابل عمل نظر آئے گا۔ سر آرتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل" میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

"اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے۔ اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی دائمی امن حاصل کیا جائے یا فطرت کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی قدیم راہ عمل اختیار کرے۔ جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہ عمل اختیار کرنا پڑیگی۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔"

لہذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر ہے تو وہ روح اسلام کے خلاف اس قدر نہیں جارہا ہے جس قدر کہ روح عصر کے خلاف۔ اگر وہ نسلوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو عصر جدید کی روح شکست دے دیگی۔ کیونکہ عصر جدید کی روح بالکل روح اسلام کے مطابق ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کا اتحاد تورانیت ایک سیاسی جواب ہے اتحاد اسلاف یا اتحاد المانیویت یا اتحاد انگلوسیکسن کا۔

اگر مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو قومی نصب العین سے متعلق اسلام کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ اگر قومیت کے

یعنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان تک قربان کرتے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیّت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصوّر بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصُول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیّت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیّت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریّت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رُو سے یا تو اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب سے مشابہ ہیں جن سے معاشی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ قومیّت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیّت میں ہیں اور جہاں قومیّت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریّت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ کیونکہ یہاں اسلام اور قومیّت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیّت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیّت سے خودمختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہو گی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔

سطورِ بالا میں دنیائے اسلام کی صحیح صورتِ حال کو اجمالی طور پر پیش کر دیا گیا ہے اگر اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائیگا کہ وحدتِ اسلامی

کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ وحدت اسلامی، جیسا کہ میں نے پہلے توضیح کی ہے، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد پر جن میں پانچ مشہور ارکان شریعت کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ وحدت اسلامی کے یہ اساسی عناصر ہیں جو رسول کریم کے زمانے سے اب تک قائم ہیں۔ گو حال میں بہائیوں نے ایران اور قادیانیوں نے ہندوستان میں ان عناصر میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وحدت دنیائے اسلام میں یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے میں سہولت پیدا کرتی ہے خواہ یہ اتحاد عالمگیر ریاست (مثالی) کی صورت اختیار کرے یا اسلامی ریاستوں کی جمعیت کی ایک صورت یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت جن کے معاہدات اور میثاقات خالص معاشی و سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوں گے۔ اس طرح اس سیدھے سادے مذہب کی تعقلی ہیئت ترکیبی رفتار زمانہ سے ایک تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کی گہرائی قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے جن کی تشریح پیش نظر مقصد سے ہٹ کر یہاں ممکن نہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدت اسلامی صرف اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب کہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں۔ اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہو جاتی ہیں جبکہ مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی

جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔
وہ سیاسی وحدت کی ایک صورت سے کسی دوسری صورت کی طرف جو ابھی متعین
نہیں ہوئی ہے اقدام کر رہا ہے۔ دنیائے جدید میں حالات اس سرعت کے
ساتھ بدل رہے ہیں کہ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی تقریباً ناممکن ہے۔ اگر
دنیائے اسلام سیاسی وحدت حاصل کر لے (اگر ایسا ممکن ہو) تو غیر مسلموں کے ساتھ
مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف تاریخ
ہی دے سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جغرافی حیثیت سے یورپ
اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے لحاظ سے، اور زندگی کے مشرقی و مغربی
نصب العین کے ایک امتزاج کی حیثیت سے اسلام کو مشرق و مغرب کے مابین
ایک طرح کا نقطہ اتصال بننا چاہیے لیکن اگر یورپ کی نادانیاں اسلام کو ناقابل
مفاہمت بنا دیں تو کیا ہوگا؟ یورپ کے روزمرہ کے حالات جو صورت اختیار
کر رہے ہیں ان کا اقتضا یہ ہے کہ یورپ اپنے طرزِ عمل کو قطعیۃً بدل دے جو اس
نے اسلام کے متعلق اختیار کیے ہیں۔ ہم صرف یہ توقع کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت
پر معاشی لوٹ اور شہنشاہی ہوس کا پردہ نہیں پڑے گا۔ جہاں تک ہندوستان
کا تعلق ہے میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کسی ایسی سیاسی
تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر
ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور
حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔

ہز ہائینس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے

لئے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں پر کیوں حملے کئے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں وہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا ہے۔ وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ (دیکھو اسٹار، الہ آباد، ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء)

"گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلعم اس کے رسول ہیں۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو۔ اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو۔ پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو"

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں۔

حصّہ سوئم
متفرّق بیانات

جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو نہ مٹا یا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹا یا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے عہدہ معتمدیت سے استعفیٰ کا خط

جو ۲۲ جون ۱۹۲۸ء کو شائع ہوا۔

جیساکہ آپ کو معلوم ہے میں گزشتہ مئی کے دوران سے کچھ بیمار ہوں اور اسی سلسلہ میں کچھ دن ہوئے میں علاج کی خاطر دہلی گیا ہوا تھا۔ ۱۲ جون کو واپسی پر اخبارات میں لیگ کی یادداشت جو سائمن کمیشن کو بھیجی گئی ہے کی تلخیص میری نظر سے گذری۔ آپ کو علم ہے کہ مسودہ مرتب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں جو صاحب صدر کے مکان پر ہوا تھا۔ میں نے بعض ضروری امور کے متعلق اپنا اختلاف ظاہر کیا تھا، بالخصوص صوبجاتی خود اختیاری کے مسئلہ پر۔

اصل مسودہ عارضی نوعیت کا تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ لیگ کے دوسرے ممبران کی رائے حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ کچھ عرصے تک ممبران کی ایک بڑی تعداد نے اصل مسودہ میں زیر بحث مسائل پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان آراء کے پیش نظر ایک آخری مسودہ طیار کیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت تک مجھے بیماری نے آن دبوچا اور اس وجہ

میں آخری مسوّدہ کی بحث میں شریک نہ ہو سکا۔

لیکن اب اخبارات میں لیگ کی یادداشت کا اقتباس دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لیگ نے مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ایک وحدتی (Unitary) صوبائی نظام کی تجویز پیش کی ہے جس کی رُو سے محکمہ جات قانون، امن اور عدل براہ راست گورنر کو سونپ دیئے جائیں گے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجوّزہ نظام درپردہ دو عملی (Diarchy) پر مشتمل ہوگا اور کسی لحاظ سے آئینی ترقی کے مترادف نہ ہوگا۔

چونکہ میں ابھی تک اپنی اس رائے پر قائم ہوں جو میں نے مسوّدہ مرتب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں پیش کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کرنا چاہیئے (اور میرے خیال میں تمام مسلمانان پنجاب کی یہی رائے ہے) مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا معتمد نہ رہنا چاہیئے۔ ازراہ کرم میرا استعفا منظور فرمائیں۔

سر فرانسیس ینگ ہسبنڈ کے نام خط سے چند اقتباسات

جو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو شائع ہوئے۔

میں نے "لائف ان دی سٹارز" (Life in the stars) میں ان صفحات کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے جہاں آپ نے جماعتی مفاد کے

پیش نظر افراد میں باہمی اشتراک اور تعاون کے جذبہ عالیہ پر بحث کی
ہے۔ یہ جذبہ جس کے اطلاق کو آپ نے بے حد وسعت دی ہے
اس کتاب کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔

آپ نے ہمارے سامنے ایک بہت بلند معیار پیش کیا ہے۔ ہمیں
توقع ہے کہ انگریز اور دوسری تمام قومیں اس معیار تک پہنچنے کی پوری
کوشش کریں گے۔ انگلستان پر جیسے آپ نے اس کتاب میں خصوصیت
سے مخاطب کیا ہے اور جس کے متعلق آپ کو یقین کامل ہے کہ اس معیار
پر پورا اتر سکتا ہے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جنگ و جدال اور قومی تنفر کی
داخلی طاقتوں کے خلاف جہاد کرنے میں پیش قدمی کرے۔ ہم ہندوستانی
اس نیک کام میں تعاون پیش کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھیں گے۔
آپ اسے خوشامد نہ سمجھیں کیونکہ یہاں ہم میں سے بہت سے لوگوں کا
اور میرا خود بھی یہی خیال ہے کہ انگلستان اس وقت اس مقصد کے
حصول کے لئے تمام بنی نوع انسان کی قیادت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔
وہاں کے لوگوں کی سوجھ بوجھ، ان کا انسانی فطرت کے گہرے مطالعے پر
مبنی سیاسی شعور، ان کی متانت، مستقل مزاجی، متعدد لوازم میں دوسروں
پر ان اخلاقی برتری، مادی ذرائع پر ان کا حیرت انگیز انضباط، انسانی
فلاح و بہبود کے لئے بہت سی تحریکوں کا وجود اور زندگی کے ہر شعبہ
میں ان کی تنظیم، یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ کوئی غیر ملکی ان کی تعریف کئے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا خوبیوں کا حسن اجتماع

ہی دنیا میں برطانوی قوم کے اس غیر معمولی اقتدار کا باعث رہا ہے۔

میں اس دن کا منتظر ہوں جب کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اختلافات دور ہو جائیں گے اور دونوں ممالک نہ صرف اپنے لیے بلکہ بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے کوئی پروگرام بنائیں گے۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی صورت حالات سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اس خیال سے مرعوب ہو کر کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کرتے کہ آج کل دونوں ممالک میں شدید اختلافات موجود ہیں۔ لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ اختلافات باہمی مطابقت کے دور کا لازمی نتیجہ ہیں اور کسی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے بغیر دور ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ ہم ہوشمندی سے کام لیں اور تنفر، غرور، تشدد اور عدم رواداری کے جذبات پر قابو رکھیں۔ باہمی مطابقت کے ایسے دور تاریخ میں عام ہیں اور آفرینش عالم سے چلے آئے ہیں۔ یورپ کی تاریخ ان سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح مشرق و مغرب میں بھی مطابقت اور موافقت ناگزیر ہے۔ اگرچہ قدرتی طور پر اسے عملی جامہ پہنانے میں مقابلۃً زیادہ عرصہ لگ گیا ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود ہندوستانیوں میں باہمی مطابقت کی ضرورت ہے۔ اور جب تک ہم اپنے خانگی جھگڑے طے نہ کر لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا نہ سیکھ لیں، ہم

بین الاقوامی امن کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ہندوستان کے اندرونی جھگڑے اور اختلافات عالمگیر امن کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ لیکن موجودہ حالات کی نزاکت کے باوجود مجھے فرقہ وارانہ مفاہمت کے امکان کی قوی اُمید ہے۔ آج کل ہندوستانیوں کی سب سے بڑی ضرورت ہندو مسلم مسئلہ کا حل ہے۔ اس مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت اور اس کے حل کرنے میں عملی مشکلات اور مصائب کے پیش نظر بھی مجھے بہت سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے اس خیال سے اختلاف ہے کہ ہندو مسلم سمجھوتا ناممکن ہے اور اس ضمن میں تمام کوشش رائگاں جائے گی۔ اور مجھے یہ کہنے سے بھی عار نہیں کہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں ہمیں برطانیہ کی امداد کی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ اس کے اغراض نیک نیتی پر مبنی ہوں۔

آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادّی مفاد کے پیش نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور انہیں برسر اقتدار رکھے تو ہندوستان کے مسلمان اس بات پر مجبور ہوں گے کہ سوراجیہ یا اینگلو سوراجیہ نظام حکومت کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا۔ مزید براں اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کے آغوش

میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوّق و اقتدار کو سخت دھکا لگے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی لوگ فطرتاً لامذہب نہیں ہیں۔ بلکہ میری رائے میں وہاں کے مرد اور عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معیّنہ عرصہ تک نہیں رہے گی۔ یہ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کا انتظام دہریّت کی بنیاد پر دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ حالات کے اپنے معمول پر آجانے کے بعد جونہی لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا انہیں یقینی طور پر اپنے نظام کے لئے کسی مثبت بنیاد کی تلاش کرنی ہوگی۔

اگر بالشیوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار بھی شامل کر دیا جائے تو بالشیوزم اسلام کے بہت ہی قریب آجاتا ہے۔ اس لئے میں متعجب نہ ہونگا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس حیثیت پر ہوگا جو نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی ہوگی۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ ہندوؤں کے خلاف مجھے تعصب ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان کی قربانیوں اور ہمت کا جس کا انہوں نے پچھلے چند سالوں میں مظاہرہ کیا ہے، دل سے مدّاح ہوں۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں ممتاز شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اور وہ بہت تیزی سے معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے راستہ پر گامزن ہیں۔ مجھے

کوئی اعتراض نہیں اگر ہندو ہم پر حکومت کریں بشرطیکہ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت اور شعور ہو۔ لیکن ہمارے لئے دو آقاؤں کی غلامی ناقابلِ برداشت ہے۔ ہندو اور انگریزوں میں سے صرف ایک ہی کا اقتدار گوارا کیا جا سکتا ہے۔

میں نے مختصر طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کا نظریہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ہندو مسلم سمجھوتہ کے متعلق مایوس ہوں۔ مجھے تو امید ہے کہ آیندہ گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مسئلہ کا کوئی نہ کوئی اس قسم کا حل ضرور مل جائے گا جس سے نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ انگریز بھی مطمئن ہوں گے۔ ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حالات کا روشن پہلو لینا چاہیئے۔ اور بہترین نتائج کی خواہش، معمولی نتائج کی توقع اور بدترین نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ بعض لوگ یہ ضرور کہیں گے کہ اس قسم کی امیدیں رکھنا تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن نہ ختم ہونیوالے جھگڑے اور فسادات، عدم تعاون اور سول نافرمانی، برطانوی حکومت کا تشدد۔ بنگال کے انتہا پسندوں کی دہشت پسندی اور کانپور کے بلوؤں کے پیش نظر اس قسم کی امیدیں غلط معلوم ہوتی ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جمہوریت کے ساتھ جھگڑے اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ جمہوریت کامل سیاسی سکون کی ضامن ہے تو

وہ تاریخ سے بالکل ناواقف ہے۔ حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے۔
جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات و شکایات کو پھر سے ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے جنہیں شخصی حکومت کے دور میں دبا دیا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو۔ جمہوریت ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کی موجد ہوتی ہے جو بسا اوقات ناقابل عمل ہوتی ہیں۔ یہ اختیار کا آسرا نہیں لیتی۔ بلکہ تقریروں، اخباروں اور پارلیمنٹ میں بحث و تمحیص سے قوت حاصل کرتی ہے اور بتدریج لوگوں کو کسی مسئلہ کے ایسے حل کو قبول کرنے پر تیار کر لیتی ہے جو معیاری تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حالات کے پیش نظر قابل عمل ہوتا ہے۔
چنانچہ جب میں ہندوستان کے گزشتہ دس سالوں کے ہنگامہ خیز واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو حسرت اور ناامیدی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے میں انگلستان اور ہندوستان دونوں کو ایک قابل ستائش آغاز کے لئے مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں۔
اس میں شک نہیں کہ ہمیں جمہوریت کی بڑھتی ہوئی دقتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہندوستان اور انگلستان میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اس بات سے اتفاق نہ کرتا ہو کہ ان دقتوں سے یہ ضرور فائدہ ہوا ہے کہ ہر شخص آج ہندوستانی سلف گورنمنٹ کے مسائل کو دس سال پہلے کے مقابلہ میں بہتر سمجھتا ہے۔ اور خوبی کی بات یہ ہے کہ یہ تمام تکلیف دہ لیکن مفید سبق ہندوستانی

حکومت کو ڈھائے بغیر حاصل ہوئے ہیں۔

جمہوری طرزِ حکومت میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں لیکن انسانی تجربہ اس بات کو ثابت کردیتا ہے کہ یہ دقتیں ناقابلِ عبور نہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے اعتقاد سے متعلق رہا ہے اور آج بھی یہی صورت ہے۔ اور ہمارے اعتقاد کا دارومدار رواداری اور شعور پر ہے۔

ہمیں اس وقت سرعت کے ساتھ ہندوستانی سیاسی گتھی سلجھانے کے لیے اعتقاد کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یورپ میں اعتقاد بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے حکمران اور ان کے اعمال دس سال پہلے کی نسبت آج اس کی اہمیت کو سمجھنے کی زیادہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

اس لئے مشرق اور مغرب دونوں میں ہوم رُول کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے ہمیں جھگڑے اور فساد سے اجتناب کرتے اور ایک مشترکہ نصب العین کو تسلیم کرنے کے لیے سرگرم کار ہوجانا چاہیئے۔

کل دُنیا مسلم کانگرس کے تاثرات کے متعلق بیان

جو یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا۔

مجھے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے چند مشترک مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا دل ان مقامات سے منسوب روایات کی

صداقت کا قائل نہ تھا لیکن اس کے باوجود میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خصوصاً حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش سے۔

میں نے دیکھا کہ بیت لحم (Bethlehem) میں کلیسا کی قربانگاہ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ایک ایک حصہ جداگانہ طور پر آرمینی۔ یونانی اور کیتھولک خیالات کے لوگوں کو دیا گیا ہے۔ یہ فرقے ہمیشہ آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو خون خرابہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کی قربانگاہ کی بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور ہندوستانی حالات کے خلاف دو مسلمان سپاہی ان میں بیچ بچاؤ کرتے ہیں۔

میں چند سب کمیٹیوں کا ممبر بھی تھا جنہیں چند مخصوص تجاویز پر بحث کرنی تھی۔ بدقسمتی سے میں تمام جلسوں میں شریک نہ ہو سکا۔ ایک سب کمیٹی کے جلسے میں میں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کہ بیت المقدس میں قاہرہ کی جامعہ ازہر ایسے قدیم اور پرانے اصولوں پر ایک یونیورسٹی بنائی جائے اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل موجودہ طرز کی ہونی چاہیئے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی اور یہ افواہ کیسے اڑی کہ میں بیت المقدس میں یونیورسٹی قائم کرنے کا سرے سے ہی مخالف تھا۔ رائٹر کا ایک تار اس خبر کا ذمہ دار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں دل سے اس بات کا حامی ہوں کہ عربی زبان بولنے والے ممالک

ایک چھوڑ کئی ایسی یونیورسٹیاں قائم کریں جو عربی زبان میں نئے علوم کا اضافہ کریں کیونکہ صرف عربی ہی وہ غیر یورپی زبان ہے جو موجودہ زمانے میں خیالات کی ترقی کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔

انڈین فرینچائز کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق بیان

جو ۹ جون ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

ذاتی طور پر میری رائے میں خالص مغربی طرز کی جمہوریت ہندوستان میں کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے میں کمیٹی کے ان اقدامات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کی رو سے اسی نے ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور مختلف خیال کے لوگوں کو آزادانہ اظہار رائے کا موقعہ دیا۔ ان میں سے ایک طریقہ جو میرے خیال میں اقتصادی طور پر پسماندہ جماعتوں میں بہت مقبول ہوگا یہ ہے کہ یکساں رائے دہندگی کے اصول کو ان کے مقید مطلب بنانے کے لئے کچھ بدل دیا گیا ہے۔

رپورٹ میں کمیٹی کی دوسری قابل ذکر تجویز یہ ہے کہ فہرست رائے دہندگاں جلد از جلد تیار کی جائے تاکہ اصلاحات کے نفاذ سے پہلے ہمیں معلوم ہو سکے کہ مختلف فرقوں میں آبادی کے لحاظ سے رائے دہندگاں کا کیا تناسب ہوگا۔

ط Indian Franchise Comittee

آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس ملتوی ہونے پر بیان

جو ۲۹ جون ۱۹۳۲ء کو شائع ہُوا۔

چونکہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کے اکثر ممبران کی یہ رائے تھی کہ مجلس کا ۳ جولائی کو الہ آباد میں ہونے والا اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ اس لئے اجلاس جولائی کے آخر تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ البتہ ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ جلد از جلد منعقد کرنے کا خیال ہے تاکہ حالات کا جائزہ لیا جا سکے۔ مسلمانان ہند کو توقع ہے کہ جولائی کے آخر تک کوئی واضح اعلان ہو جائے گا۔ چونکہ حکومت برطانیہ کے پاس فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنے کا پورا مواد پہنچ چکا ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ فیصلہ کرنے میں اب مزید تاخیر نہ ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ موجودہ حالات اور ہماری پچھلے دو سال کی کوششوں کے پیش نظر الہ آباد کا جلسہ ملتوی کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کانفرنس کا صدر ہونے کی حیثیت سے جلسہ کو ملتوی کرتے وقت مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ جہاں مجھے متوقع فیصلہ کے متعلق مسلمانان ہند کی بےچینی اور انتظار کا علم ہے وہاں مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اب قوم کے سامنے بڑا مسئلہ صرف فیصلہ کی نوعیت کا رہ گیا ہے نہ کہ اعلان کی تاریخ کا۔ ہمارے آئندہ پروگرام کی تشکیل کا انحصار فیصلہ کی نوعیت پر ہونا چاہیئے نہ کہ اعلان کی تاخیر پر۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس ملتوی ہونے پر دوسرا بیان

جو ۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بعض چیدہ چیدہ ممبران کے الہ آباد میں ۴ جولائی کو منعقد کردہ جلسے کی کارروائی میری نظر سے گزری۔ میں کانفرنس میں ایک انڈیپینڈنٹ پارٹی کی تشکیل کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مسلم کانفرنس کے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں میں نے اپنے خطبے میں کہا تھا:-

قوم کی قیادت کے معاملہ میں اچھی طرح سوچ بچار نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات بہت ہی نازک موقعوں پر ہماری سیاسی جماعتوں میں ناچاقی اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ ادارے پورے طور پر اپنے اندر وہ ضبط اور تادیب پیدا نہیں کر سکتے جو سیاسی جماعتوں کے لئے بیحد ضروری ہے۔ میرے نزدیک اس کا واحد علاج یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی سیاسی جماعت صرف ایک ہی ہونی چاہیئے اور ملک کے ہر صوبے اور ضلعے میں اس کی شاخیں ہوں۔ اس جماعت کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اس کا دستور العمل ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کے سیاسی خیال کے لوگ برسر اقتدار آ کر اپنے خیالات اور اصولوں کے مطابق قوم کی صحیح قیادت کر سکیں۔ میرے خیال میں یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم آپس کے بگاڑ اور اختلافات کو دور کر کے ہندوستان میں دوبارہ ضبط و تادیب پیدا کریں۔ اور اس

طرح قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کر کے اسلام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔

اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ بلا شک و شبہ مولانا حسرت موہانی اور دوسرے اصحاب نے کانفرنس میں ایک نئی پارٹی کی تشکیل کر کے منزل مقصود کی طرف ایک کامیاب قدم اٹھایا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مسلمانان ہند کو یہ حق حاصل ہے کہ مولانا شفیع داؤدی کے استعفیٰ اور الہ آباد کے جلسہ میں انتظامیہ مجلس کے ۳ رجولائی کو ہونے والے اجلاس کے ملتوی کر دینے کے اقدام کے خلاف قرارداد پاس ہونے سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کے متعلق میرے خیالات معلوم کریں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شفیع داؤدی کا اقدام کسی صورت سے بھی صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اخبارات میں ان کے استعفیٰ شائع ہونے کے فوراً بعد میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اسے واپس لے لیں۔ اور سید ذاکر علی اور دوسرے اصحاب سے آپس کے طریقہ پر سمجھوتہ کر لیں۔

انتظامیہ مجلس کے اجلاس کے ملتوی کرنے کے بارے میں جو کچھ میں نے کیا وہ یہ تھا کہ چند وجوہات کے پیش نظر میں نے جلسہ ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ مشورہ صائب اور نہایت مناسب تھا۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس سلسلہ میں بیشمار تار مولانا شفیع داؤدی، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور میرے نام موصول

ہوئے تھے بلکہ اس لئے اور بھی کہ ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسہ میں جو شملہ میں ہوا تھا اور جس میں بدقسمتی سے مَیں شریک نہ ہو سکا، مولانا شفیع داؤدی کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ اگر ان کے خیال میں فرقہ دارانہ مسئلہ کا فیصلہ ۳۱ر جولائی تک ہونے کی کوئی امید نہ ہو تو وہ جلسہ کو ملتوی کر دیں۔ ورکنگ کمیٹی کے جتنے ممبران اس جلسہ میں موجود تھے سب نے بالاتفاق رائے انہیں یہ اختیار دینا منظور کر لیا تھا اور خود مولانا شفیع داؤدی نے خوشی سے اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔ اب مولانا نے اپنے استعفیٰ اور بعد کے بیانات میں اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا اس کے متعلق مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ان حالات کے پیش نظر یہ کہنا انصاف سے بعید ہے کہ میرا فیصلہ آمرانہ نوعیت کا تھا۔ میری رائے کے مطابق اکثر ممبران جلسہ کو ملتوی کرنے کے حق میں تھے۔ میری اپنی رائے بھی یہی تھی۔ مَیں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہاں مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ فرقہ دارانہ مسئلہ کا فیصلہ اُن کے حق میں نہ ہو تو وہ حکومت سے لڑنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ وہاں میرا بھی یہ فرض ہے کہ مَیں انہیں حکومت سے لڑنے کے لئے صرف اس بنا پر مشورہ نہ دوں کہ حکومت ایک مقررہ میعاد کے اندر اس مسئلہ کا فیصلہ نہ کر سکی۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے اس صاف اور بے لاگ بیان سے مسلمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا جلسہ کو ملتوی کرنے کا مشورہ کہاں تک شملہ کی کارروائی سے متاثر تھا۔ مَیں نے اپنی خانگی اور

قومی زندگی میں کبھی کسی دوسرے کی رائے کا بلا سوچے سمجھے اتباع نہیں کیا۔ ایسے وقت میں جبکہ ملت کا اشد ضروری مفاد خطرے میں ہو میں کسی شخص کا دوسرے کی رائے پر بلا سوچے سمجھے چلنا اسلام اور انسانیت کے منافی سمجھتا ہوں۔

میں اس بات کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے بنظر احتیاط جلسہ کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیا یہ رائے قائم کرنا درست نہیں کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ لاہور کے ریزولیوشن پر عمل کرنے میں کسی دوسرے سے پیچھے رہیں گے۔ وقت آنے تک ہمیں لازم ہے کہ اپنی قوتوں کو محفوظ رکھیں۔ غیر ضروری باتوں پر اپنی قوتوں کو ضائع کرنا عقلمندی نہیں۔ حقیقی دانشمندی یہ ہے کہ قوتوں کو مناسب ترین مواقع پر کام میں لانے کے لئے محفوظ رکھا جائے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس میں باہمی اختلافات کے متعلق بیان

جو ۲۰ رجولائی ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

جہاں تک فرقہ وارانہ فیصلہ کے اعلان کا تعلق ہے مسلمانوں کے رویہ میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ نئی پارٹی کے لیڈر چند ہی روز ہوئے لاہور آئے تھے اور کانفرنس کے گزشتہ اور آئندہ کام کے متعلق مجھ سے کافی لمبی چوڑی گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں وہ میری رائے سے

متفق ہو گئے یعنی چونکہ برطانوی حکومت نے فرقہ دارانہ مسئلہ کا فیصلہ کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور خاص طور پر جب کہ یہ فیصلہ ہندوستانی اقوام کی اپنی تجاویز کے مطابق ہی ہونے کی توقع ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ اس فیصلہ کا انتظار کریں اور اس کے اعلان کے فوراً بعد ہی کسی مناسب مقام پر کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ منعقد کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ قوم نے اس وقت بڑی سمجھ بوجھ سے کام لیا اور اس مسئلہ پر ہم آپس میں بگاڑ سے بچ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند نے بحیثیت مجموعی پچھلے دس سال کے تجربہ کی بنا پر موجودہ سیاسی معاملات کو تقریباً ہر پہلو سے بخوبی سمجھ لیا ہے اور مجھے امید واثق ہے کہ وہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے تمام پہلوؤں پر پورے غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لیں گے۔

سکھ مطالبات کے متعلق بیان

جو ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا۔

میں نے سکھ لیڈروں کی عرض داشتیں، منشورات اور قراردادیں بڑی دلچسپی سے پڑھی ہیں۔ ان میں سے بعض سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے میں اُن سے زبانی تُو تُو، مَیں مَیں کرنا مناسب خیال نہیں کرتا۔

سکھوں کی عرض داشتوں، منشورات اور جلسوں میں جن باتوں کا

اظہار کیا گیا ہے ان کی توقع فرقہ دارانہ مسئلہ کا فیصلہ ہونے کے موقع پر ہی ہو سکتی تھی۔ مزید برآں بقول سردار اجل سنگھ سکھ ملک کے آئینی اصلاحات کی نسبت فرقہ دارانہ مسئلہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا رویہ خواہ وہ اپنی جماعت سے وفاداری کی وجہ سے ہی اختیار کیا گیا ہو ان لوگوں کو قابل قبول نہیں ہو سکتا جو ایک خاص جماعت کے جائز حقوق کی حفاظت کو اپنا فرض خیال کرنے کے ساتھ ساتھ سارے ملک کے عام مفاد کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میرے خیال میں مسلمانوں کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سکھ دوستوں کی اس تحریر پر جس میں انہوں نے مسلم مطالبات سے اپنے اختلافات کو تاریخی حیثیت سے جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے برا منائیں۔ لیکن مجھے سکھ دوستوں کے اُن الفاظ سے کافی تکلیف پہنچی ہے جو انہوں نے اپنے اختلافات کے اظہار کے لئے استعمال کیئے ہیں۔ یہ الفاظ سکھ پنتھ میں مذہبی جنون اور تعصب پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی کثرت نمائندگی کے حقوق کی مخالفت میں سکھوں نے جو خالصتہً منفی رویہ اختیار کیا ہے وہ اس کے بُرے نتائج سے بے خبر ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں کی شہ پر پنجاب میں سکھوں کے اس رویہ نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو قدرتی طور پر ہندوؤں سے خائف کر دیا ہے جن کو مرکز اور چھ صوبوں میں غلبہ حاصل ہو گا۔ اقلیتوں کا یہ بڑھتا ہوا خوف یقینی طور پر

ہندوستان کی آئندہ تاریخ پر بہت بڑا اور مہلک اثر پیدا کرے گا۔

ہماری اپنی پوزیشن بالکل واضح ہے۔ مسلمانان ہند جہاں اپنے قومی تحفظ کے لئے کوشاں ہیں۔ وہاں وہ ملک کی آئینی ترقی کے بھی دل سے خواہشمند ہیں ہندوستان میں ایک بڑی اقلیت کی حیثیت سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں۔ جو بے حد ضروری ہے۔ وہ مرکز کے علاوہ ان صوبوں میں بھی جہاں وہ بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ اکثریت والی قوم کے غلبہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے طیار ہیں۔ بشرطیکہ انہیں بھی بعض دوسرے صوبوں میں اپنی کثرت سے اسی قسم کا فائدہ اٹھانے دیا جائے۔ مسلمان اپنی ہمسایہ قوموں اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنا یہ نظریہ متعدد بار پیش کر چکے ہیں اور سکھوں کے سوا باقی تمام اقلیتوں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم بھی کر لیا ہے۔

سر جوگندر سنگھ کی سکھ مسلم مسئلہ پر گفت و شنید کی تجویز کے متعلق بیان

جو ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

۲۹ جولائی کو مجھے سردار جوگندر سنگھ کا ایک خط موصول ہوا سردار صاحب کے خیال میں اس کو ایک مختصر نوٹ کہنا چاہئے۔ چونکہ یہ آئندہ

بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔ مجھے اس پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دوسرے مسلمانوں کو بھی اس قسم کے خطوط لکھے ہوں۔ میرے خط پر "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خط کا مضمون پہلے ہی اخبارات کو مل چکا ہے۔

میں بڑی خوشی سے پنجاب کے لیے جائز اصولوں پر ایک فرقہ وارانہ معاہدہ کا خیر مقدم کرتا لیکن جس صورت سے سر جگندر سنگھ کی اس تحریر کو اخبارات میں شائع کیا گیا ہے اس نے مجھے ساری کارروائی کے متعلق شک میں ڈال دیا ہے۔

جیسا کہ میرے جواب سے ظاہر ہے میں نے سر جوگندر سنگھ کی تجاویز کو چند وجوہات کی بنا پر تسلیم نہیں کیا۔ اوّلاً اگرچہ ان تجاویز کی رُو سے بظاہر مسلمانوں کو ایوان میں ایک نشست کی اکثریت حاصل ہو جاتی ہے لیکن حقیقت میں مسلمانوں کو اکثریت سے گرا کر غیر مسلموں کے برابر ہی نہیں بلکہ اقلیت کی صف میں لا بٹھایا ہے۔ ثانیاً مسلمان کسی صورت میں بھی ۵۱ فی صدی سے کم نمائندگی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ۵۱ فی صدی نشستوں کی رعایت جیسا کہ خیال کیا جا رہا ہے مسلم راج نہیں کہلایا جا سکتا۔ ثالثاً یہ دیکھتے ہوئے کہ سر جوگندر سنگھ فرقہ وارانہ مسئلہ کا فیصلہ برطانوی حکومت کے اعلان سے پیشتر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو یہ بھی لکھا کہ ان کی تجاویز پر حکومت کے فیصلہ کے بعد بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

میرے خط کے جواب میں مجھے ۳ اگست کو ان کا ایک اور خط ملا جس میں اُنھوں نے ایک بالکل نئی تجویز پیش کی اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہُوں جو مسلمانوں کیلئے اتنی ہی ناقابل قبُول تھی جتنی کہ پہلی۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ایک پیغام سے مظہر ہے کہ یہ خط وکتابت حکومت برطانیہ کو بھیج دی گئی ہے۔ اس سے مجھے ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت برطانیہ کا موعُودہ اعلان مزید التوا میں نہ پڑ جائے۔

اس لئے میں اس حقیقت کا اظہار کر دینا اشد ضروری سمجھتا ہُوں کہ حکومت کے فیصلے سے پیشتر یا بعد کوئی فرقہ دارانہ سمجھوتہ جو اقلیتوں کے معاہدہ کے خلاف اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ۵۱ فی صدی نشستوں سے کم کا حامل ہو مسلمانوں کے لئے ناقابل قبُول ہو گا۔ اور اگر اس قسم کی خط و کتابت سے حکومت کے اعلان میں مزید تاخیر ہو گئی تو حالات اور زیادہ ناسازگار ہو جائیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ سر جوگندر سنگھ کی تجاویز کل ۱۷۵ نشستوں میں سے ۱۵۰ نشستوں کے جُداگانہ انتخاب کے اصُول کو تسلیم کرتی ہیں۔ ان کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حساب کے مطابق وہ مسلمانوں کو ایوان میں کم از کم ایک نشست کی اکثریت دینے کو بھی تیار رہیں۔ ان حالات کے پیش نظر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے سکھ بھائی مسلمانوں کے کم سے کم جائز مطالبات تسلیم کر کے ان کے غیر مسلمانوں کے برابر یا اقلیت میں ہو جانے کے خدشات کو دُور کرنے کی کوشش کیوں نہیں

کرتے۔ حالانکہ دوسری تمام اقلیتیں مسلمانوں کے ان مطالبات کو تسلیم کر چکی ہیں۔

سکھ مسلم مسئلہ پر گفت و شنید کے متعلق

آل انڈیا مسلم کانفرنس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی توضیح میں بیان

جو ۱۰ اگست ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

میں اسے اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ میں یہ واضح طور پر بیان کر دوں کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے دہلی کے آخری اجلاس میں سکھ مسلم مسئلہ پر جو گفتگو شملہ میں ہوئی۔ قرارداد کیوں منظور کی۔

اوّلاً کمیٹی کے ممبران نے فرقہ وارانہ سمجھوتہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے یہ خیال کیا کہ کہیں اس وقت یہ گفت و شنید سرکاری اعلان کو معرض التوا میں نہ ڈال دے اور سکھ مسلم تعلقات کو اور زیادہ خراب نہ کر دے۔

ثانیاً۔ چند سکھ لیڈروں کے اخبارات میں شائع شدہ بیانات کے پیش نظر کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ اس گفت و شنید سے کوئی نتیجہ مترتب نہ ہو گا۔ سر جوگندر سنگھ کے آج کے بیان سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

سر جوگندر سنگھ نے جو خط مجھے بھیجا تھا اس میں انہوں نے صاف الفاظ میں مسلم نشستوں کی تعداد ۸۸ اور غیر مسلموں کی تعداد ۸۷ رکھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تعداد مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ان کے اپنے اندازے پر مبنی تھی۔ لیکن وہ مجھے معاف کریں اگر میں صاف بیانی سے کام لوں۔ ان مخصوص ہندسوں سے مدعا مجھے اس دھوکہ میں ڈالنا تھا کہ سردار صاحب اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک کی اکثریت پر رضامند ہیں۔ سردار جوگندر سنگھ نے مجھ پر یہ الزام تراشا ہے کہ میں نے ان کی تجاویز سے غلط نتائج نکالے ہیں لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے خط میں مذکور مقررہ تعداد کے پیش نظر کسی استنباط کی ضرورت ہی نہ تھی۔

دوسری طرف ان کی دی ہوئی تعداد کے باوجود میں ان کی اس بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا جو انہوں نے اب بغیر تعداد مقرر کئے ہوئے صاف طور پر ظاہر کر دی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کو مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کی نشستوں میں کچھ نشستیں ملنے کا امکان ہو سکتا ہے۔

مجھے اس امر سے اتفاق ہے کہ انہوں نے صرف ایک امکانی صورت ہی پیش کی تھی۔ لیکن اگر ہمارے سکھ بھائیوں نے حالات کو اسی طرح سمجھا ہے تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اس گفت و شنید سے کسی مفید مطلب سمجھوتے کی امید رکھنی عبث ہے۔

سر جوگندر سنگھ پھر پلٹا کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیشکش خواہ کسی نوعیت کی تھی یہ کسی صورت سے سکھ پنتھ کی طرف سے نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان تجاویز کا ماخذ کیا تھا اور نہ ہی اس معاملہ میں اندازہ بازی کی ضرورت تھی۔ اپنی تجویز کی چند اہم تفصیلات دینے کے بعد سر جوگندر سنگھ اپنے خط میں خود فرماتے ہیں۔ "اگر مسلمان سکھوں کو مرکز میں پانچ فیصدی صوبہ سرحد میں چھ فی صدی اور مرکزی کابینہ میں ایک نشست دلانے میں مدد دیں تو سکھ اقلیتوں کے معاہدہ پر دستخط کر دیں گے"

خیر اب اس جھگڑے میں پڑنے سے کیا فائدہ۔ اس بیان کا مقصد تو ورکنگ کمیٹی کی پوزیشن کو واضح کرنا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں نے اپنا یہ فرض ادا کر دیا ہے۔

جہاں تک شملہ والی سکھ مسلم بات چیت کا تعلق ہے۔ میں یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں ہر معقول ٹھوس سمجھوتے کے لیے تیار ہوں۔ جو یہ ضروری نہیں کہ ۱۷ اگست کو ہونے والے سرکاری اعلان سے پیشتر ہی ہو۔ میں بحیثیت مسلم کانفرنس کے صدر کے ایسی گفت و شنید میں اس وقت تک حصہ نہیں لے سکتا جب تک کہ ورکنگ کمیٹی مجھے اس کے متعلق اختیار نہ دے دے۔

فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق بیان (جو ۴۲ اگست ۱۹۳۲ء کو شائع ہُوا)

بادشاہ سلامت کی حکومت کے فیصلہ پر اس اقلیتوں کی سرزمین میں یہاں کے خاصہ کے مطابق تنقید ہو رہی ہے۔ یہ تنقید اُن حقیقت کو نظر انداز کرنے والے سیاست دانوں کے لئے اپنی جگہ ایک سبق ہے۔ جو ہندوستان کے پیچیدہ مسئلہ کو ایک معمولی سی بات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ سارا ہندوستان ایک قومی نظریہ کا پابند ہے یا ہو سکتا ہے۔ اور یہ تمام آتش بازی کی طرح ایک لمحہ بہار دکھا کر ختم ہونے والے جملے ان لوگوں کی زبان سے نکلے ہیں جو ایک تیسرے فریق کو اپنے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے دعوت دے کر اپنی نا اہلیت کا اعلانیہ ثبوت دے چکے ہیں۔ اور خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کے باوجود ہمارے درمیان سمجھوتہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہُوا ہے۔

اس بے اصولی تنقید کے سیلاب میں ہندوستانی سیاست سے بے لاگ دلچسپی رکھنے والے کے لئے سر تیج بہادر سپرو کے خیالات کا مطالعہ باعث اطمینان ہے۔ کیونکہ صاحب موصوف فہیم مدبر ہیں جو موجودہ حالات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں اور پیچیدہ صورت حال کا با لتفصیل حل سوچنے میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بمبئی کے ایک صاحب کی عجیب و غریب رائے کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر حکومت برطانیہ

کی جگہ یہ کام ڈاکٹر اقبال کے سپرد ہوتا تو بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ میں ان صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے فرقہ دارانہ مسئلہ کا فیصلہ کرنا میرے ذمہ ہوتا تو میں مسلمانان ہند سے ہرگز اتنی ناانصافی نہ کرتا جتنی کہ موجودہ فیصلہ میں کی گئی ہے۔

میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس فیصلہ کے خلاف جتنی جائز شکایات مسلمانان ہند کو ہو سکتی ہیں اور کسی فرقہ کو نہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ برطانوی ضمیر نے کسی جماعت کے ساتھ اتنی صریح ناانصافی کرنا کیسے گوارا کیا۔

غیر مسلموں کی یہ چیخ و پکار کہ پنجاب کے مسلمانوں کو اس فیصلہ کی رُو سے نمائندگی میں اکثریت حاصل ہو گئی ہے قطعی بے بنیاد ہے۔ اس صُوبہ میں مسلم اکثریت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو کسی دوسرے فرقہ کے لئے شکایت کا باعث نہ ہونی چاہیئے۔ خصوصاً جبکہ مسلمانوں کو یہ اکثریت مخلوط انتخاب جیت کر حاصل کرنی پڑتی ہو۔

حکومت برطانیہ کے اس فیصلہ کے متعلق مسلمانان ہند کی رائے اس قرارداد میں موجود ہے جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انتظامیہ بورڈ نے چند روز ہوئے دہلی میں منظور کی۔ یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال فیصلہ پر نظر غائر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دو سیاسی اصولوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ کسی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اقلیتوں کے حقوق

کے تحفظ کے لئے اُن کو اُن کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ نمائندگی دی جائے۔ ان دونوں اصولوں کے نفاد میں مسلمان ہی خسارے میں رہے ہیں۔

بنگال میں مسلمانوں کی پوزیشن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پہلے اصول کو توڑنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں اقلیتوں کو ان کی تعداد سے زیادہ جو نمائندگی کے حقوق دیئے گئے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اصول کو صوبہ سرحد میں ہندوؤں کے لئے زیادہ مفید مطلب بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کو دوسرے صوبوں میں اس قسم کی مراعات نہیں ملیں۔ پنجاب میں سکھ اقلیت کو اتنی مراعات دی گئی ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت صرف برائے نام ہی رہ جاتی ہے۔

بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۶۱ فی صدی ہے۔ اس کے مقابلہ میں نمائندگی میں وہ صرف ۴۸ء۴۸ فی صدی رہ گئے ہیں۔ اگر مسلمانانِ بنگال کو ۲ فیصدی اور نمائندگی مل جاتی تو وہاں ان کی اکثریت ہو جاتی۔ سرکار برطانیہ نے جہاں تک یورپین لوگوں کا تعلق ہے اقلیتوں کے معاہدہ کی شرائط پر عمل کیا۔ اور جہاں بنگال کے مسلمانوں کا سوال آیا یہ معاہدہ نظر انداز کر دیا گیا۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپین لوگوں کا خون خون ہے اور مسلمانوں کا خون پانی یا یہ کہ اس غیر منصفانہ فیصلہ سے انگریز کے بیک وقت دو مطلب پورے ہو جاتے ہیں۔ ایک یورپین لوگوں کی امداد

اور دُوسرے ہندوؤں کی خوشنودی۔

مسلمانوں کے سامنے اب سوال یہ ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ اب بھی مسلمانوں کے لئے ایک آئینی قدم اُٹھانے کی گنجائش ہے۔ بنگال ان صوبوں میں سے ایک ہے جہاں دو ایوان ہونگے۔ اس کے لئے ایوان اعلیٰ کا دستور ابھی مرتب ہونا ہے۔ ان ایوانوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہوگا۔ اور کیا حکومت صرف ایوان ادنیٰ کو جواب دہ ہوگی یا دونوں ایوانوں کو مِلا کر۔ یہ امور ابھی طے ہونے ہیں۔ اگر ایوان اعلیٰ میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نمائندگی مِل جائے اور حکومت دونوں ایوانوں کے سامنے جواب دہ ہو تو پھر بھی مسلمانوں کو اس صوبے میں اکثریت نمائندگی حاصل ہوسکتی ہے اور چونکہ ایوان ادنیٰ میں خصوصی حلقوں کو پوری توجہ مِل چکی ہے اس لئے مذکورہ بالا طریقہ سے بنگالی مسلمانوں کے ساتھ محض انصاف ہی ہوگا، کسی قسم کی رعائت نہ ہوگی۔

یہاں یہ بھی ایزاد کرنا ضروری ہے کہ مختلف جماعتوں میں انتخابی نشستوں کی محض تقسیم کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ اہم بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی صوبائی حکومتوں کو کتنے مزید اختیارات تفویض کیئے جاتے ہیں۔ اگر صوبوں کو حقیقی معنوں میں پورے اختیارات مِل جائیں تب ہی ہندوستان کی مسلم اور غیر مسلم اقلیتوں کو اس بات کا موقع مِل سکتا ہے کہ وہ ملک میں اپنا سیاسی درجہ بلند کر سکیں۔ اور نئے آئین

پر عمل پیرا ہونے میں مسلمان اپنی اکثریت والے صوبوں میں اپنی گزشتہ تاریخ اور قابل قدر روایات کے پیش نظر اقلیتوں کے لئے روشن خیالی اور فراخدلی کا ثبوت دے سکیں۔ میرے خیال میں مسلمانوں کا اس وقت سب سے اہم فرض جہالت اور اقتصادی پستی کے خلاف جہاد ہونا چاہیئے۔

قوم پرست مسلم لیڈروں کی لکھنؤ کانفرنس کے متعلق بیان

جو ۸ ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

جمعہ کے روز میں شملہ سے لاہور واپس آیا تو شیخ عبدالمجید سندھی، صدر خلافت کانفرنس کا ایک تار ملا۔ جس میں شیخ صاحب نے ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کے متعلق میری رائے دریافت کی تھی۔

میں نے بذریعہ تار شیخ صاحب کو جواب دیا کہ جب تک ہندوؤں کی طرف سے ہمارے سامنے چند ٹھوس اور واضح تجاویز نہ ہوں اس قسم کی کانفرنس منعقد کرنا نامناسب بلکہ بے معنی ہوگا۔

اسی شام مجھے شیخ صاحب کا ایک اور تار بدیں مضمون ملا کہ میرا تار دیر سے پہنچا اور مسلم لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھے اس کانفرنس میں شمولیت کی دعوت

بھی دی۔ جواباً میں نے اُن سے اپنے فیصلہ پر دوبارہ غور کرنے کی درخواست کی۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ کانفرنس بالکل بے موقع اور خلاف مصلحت تھی۔ مَیں نے کانفرنس میں شرکت کرنے سے اپنی مجبوری کا اظہار بھی کر دیا۔

اس وقت سے اب تک میرے پاس کئی مقامات سے تار موصُول ہو چکے ہیں کہ ایک خاص جلسہ کرکے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی پوزیشن کی دوبارہ وضاحت کرنی چاہیئے۔ اور بمبئی[له] والی چالوں کا توڑ کیا جائے۔ ان حالات کے پیش نظر مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں مجوزہ لکھنؤ کانفرنس سے مسلمانوں کے شدید اختلافات واضح کر دُوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تک ہندو لیڈروں کی طرف سے ہمارے سامنے کوئی واضح تجاویز پیش نہ کی جاویں اس کانفرنس میں بحث کس چیز پر کی جائے گی۔

مسلمانان ہند نے ہمیشہ دوسری قوموں سے سمجھوتہ کرنے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جو طریقہ جو اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہندوؤں سے سمجھوتہ نہیں بلکہ ملّت اسلامیہ میں جس کو ہم بڑی مشکل سے منظم کر سکے ہیں پھُوٹ ڈالنا ہے۔

له قوم پرست مسلمانوں کی کانفرنس کا انعقاد بمبئی میں، پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا شوکت علی۔ شیخ عبدالمجید سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے درمیان گفت و شنید کی وجہ سے ہوا تھا۔

لکھنؤ کانفرنس میں منظور شدہ قرارداد کے متعلق بیان

جو ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد پڑھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ایک خوبی بھی ہے۔ قومی مسئلہ کو طے کرنے کے لئے قرارداد میں بالکل میری پوزیشن کو دہرایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے ہندوؤں کی طرف واضح تجاویز آنی چاہئیں تاکہ ان پر غور و فکر کیا جا سکے۔

قرارداد میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ طریق انتخاب کے مسئلہ کے متعلق صرف اس وقت سوچ بچار ہو سکتا ہے جب کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے باقی تیرہ مطالبات صاف طور پر مان لئے جاویں۔ اب یہ ہندو بھائیوں کی مرضی ہے کہ وہ گفت و شنید کے لئے تیار ہوتے ہیں یا نہیں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ قرارداد ہمارے قوم پرست مسلمانوں کو پہلے کی نسبت جمہور کے زیادہ قریب لے آئی ہے۔ انتخابات کے مسئلہ پر بھی اب وہ جمہور کے فیصلہ کو مان گئے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں میں انتخابات کے متعلق جمہور کا فیصلہ موجود ہے۔ لیکن اگر اس فیصلے کے اعادہ کی ضرورت پڑی تو ہم ایسا کرنے میں بھی تامل نہ کریں گے۔

گول میز کانفرنس سے منتج آئین کے متعلق بیان

جو ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے انہیں لازم ہے کہ آنے والے انتخابات کے لئے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسی باتوں سے احتراز کریں جو آپس میں جماعتی اختلافات کا باعث بن سکتی ہیں۔ مجوزہ نظام میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے اصول کو واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اقلیتوں میں قومی نظریہ پیدا کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اب یہ لندن والے اقلیتوں کے معاہدہ میں فریق کی حیثیت سے حصہ لینے والی اقلیتوں کا اپنا کام ہے کہ وہ ان مراعات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

گول میز کانفرنسوں کے دوسرے نتائج سے قطع نظر اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس ملک میں ایک ایسی قوم کی تخلیق ہوئی ہے جو بیک وقت جدید اور قدیم ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ تاریخ کا یہ سب سے اہم واقعہ ہے۔ ایک دوربین مؤرخ بھی اس نئی پرانی، قوم کی تخلیق کے نتائج کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اس قوم کے لیڈر بہت ہوشیاری سے کام لیں گے اور لوگوں میں خود آگہی کے جذبہ کی تربیت کو بیرونی سیاسی اور معاشرتی اثرات سے بچائے رکھیں گے۔

یورپ کے حالات کے متعلق بیان

جو ۲۶ر فروری ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

یورپ کے مختلف ممالک میں پھرنے اور موجودہ زمانے کی اخلاقی ابتری دیکھنے کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو بحیثیت دین قبولیت پانے کا یہ بہترین وقت ہے۔ آج لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں یورپ کے مرد اور عورتیں اسلام اور اس کے کلچر کی تعلیمات سمجھنے کے خواہاں ہیں۔ نوجوان مسلم جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ یورپ کے مسلمان اب اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں۔ وہ آئندہ اگست میں جنیوا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس کے اغراض و مقاصد محض برادرانہ معاشرت اور کلچر تک ہی محدود ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان کانفرنس کو کامیاب بنانے میں دلی تعاون پیش کریں گے۔

میں نے قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلہ۔ طلیطلہ اور مرید کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کا قصر الحمرا کے علاوہ میں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہور عالم قصر عبدالرحمٰن اول نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لئے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے اس جگہ پر ایک ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں پر منجملہ اور لوگوں کے وزیر تعلیم ہسپانیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ہسپانیہ کی موجودہ روایات کے خلاف بہت خلیق اور روشن خیال ہیں۔ ان کے علاوہ ڈوائن کو میڈی اینڈ

اسلام (Divine Comedy And Islam) کے شہرہ آفاق مصنّف پروفیسر آسن سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ وزیر تعلیم کی زیر ہدایات غرناطہ کی یونیورسٹی میں شعبۂ عربیہ میں کافی توسیع ہو رہی ہے۔ اس شعبہ کا صدر پروفیسر آسن کا ایک شاگرد ہے۔ جنوبی اسپین میں رہنے والے لوگ اپنی موروثی الاصل ہونے اور اسلامی تہذیب کی عظیم الشان یادگاروں کو اپنے لیئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ اب پھر ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ اسے اور بھی فروغ حاصل ہوگا۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ یورپ کے مختلف ممالک میں اب بھی یہ تحریک بہت خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ اور بالخصوص ہسپانیہ میں پادریوں کا اثر آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔

قرطاس ابیض میں مرتب کیے ہوئے آئین کے متعلق بیان

جو ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

اس قسم کے آئین کیلئے ہندوستان ایسے ملک میں آبادی کے ہر حصّہ کو مطمئن کرنا ناممکن ہے۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کوئی جماعت مجوّزہ آئین کو اس کے تمام نقائص کے باوجود آزمائشی طور پر اختیار کرنے کے لئے طیار ہوگی یا نہیں؟ یہ بہت سے واقعات کی نوعیت پر منحصر ہے جن کے گہرے مطالعے کی سخت ضرورت ہے۔

White Paper ے

مسلمانوں کے لئے فیڈرل اسمبلی میں ان کی ناکافی نمائندگی بے حد مایوس کن ہے۔ ایوان ادنیٰ میں ۳۷۵ نشستوں میں سے ان کے لئے صرف ۸۲ نشستیں گارنٹی کی گئی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ کل ایوان میں مسلمانوں کی نمائندگی صرف ۲۱٫۸ فیصدی ہوگی اور ہندوستانی ریاستوں کو جن کو آبادی کے لحاظ سے فیڈرل اسمبلی میں ۲۵ فیصدی نشستوں کا حق پہنچتا ہے ۳۳٫۳ فیصدی نشستیں دے دی گئی ہیں یعنی ۸ فیصدی زیادہ۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو سب سے بڑی اقلیت والی قوم ہونے کی حیثیت سے یہ رعایت مسلمانوں کو ملنی چاہیئے تھی نہ کہ ریاستوں کو جنہیں کسی صورت میں بھی اقلیت نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ ہی ان کے حقوق کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ موجودہ آئین میں مسلم اقلیت جس نے وفاق ہند کا مطالبہ اپنے اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے کیا تھا۔ اس کے حقوق کو پامال کر کے مرکزی اسمبلی کو نامزد ممبران سے بھر دیا گیا ہے۔

فیڈرل اسمبلی کا ایک اور قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ اس میں ۹ نشستوں کو عورتوں کے لئے حقوق خصوصی کے طور پر مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ان نشستوں میں رائے دہندگان کی اکثریت غیر مسلموں کی ہوگی اس لئے مسلم خواتین کا اسمبلی تک پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔ مسلم عورتوں کو تو مسلم ملت کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے تھا۔ اس سلسلہ میں سر محمد یعقوب نے فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نوٹ لکھا تھا جس پر بالکل غور نہیں کیا گیا۔

ایوان بالا میں قابل تبدیل ووٹ کا سسٹم جسے صوبائی اسمبلیوں کے ممبر استعمال کر سکیں گے مشترکہ انتخاب کی ترویج کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس طرح مسلمان نشستوں میں اپنا پورا حصہ حاصل نہ کر سکیں گے نئے آئین کے ماتحت صوبوں میں وزرا اسمبلی کے سامنے اسی قدر کم اور گورنروں کے سامنے اسی قدر زیادہ جواب دہ ہوں گے جس قدر اب ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ گورنروں کے خاص اختیارات کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع ہے۔

بلوچستان کے لیے مجوزہ سکیم سے نہ تو بلوچی مسلمان مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مسلمانان ہند۔ اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس آئین میں مسلمانوں کے شرعی قانون کے مناسب تحفظ کا یقین بھی نہیں دلایا گیا۔

غرضیکہ قرطاس ابیض مسلمانان ہند کی غیر معمولی توجہ کا طالب ہے۔ مجھے امید ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی اس پر اچھی طرح غور و خوض کر کے مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتائے گی۔

چینی ترکستان میں بغاوت کے متعلق بیان

جو ۱۶ مئی ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا۔

ترکستان ایک وسیع ملک ہے جو اس وقت تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے پر روس کا قبضہ ہے دوسرے پر افغانستان کا اور تیسرے پر چین کا۔ ۱۹۱۴ء میں چینی ترکستان میں چینی مجسٹریٹوں کے تقرر

اور حکومت کی طرف سے وہاں کی آبادی پر جو تقریباً ساری کی ساری مسلمان ہے چینی زبان کے ٹھونسنے کی کوشش کی وجہ سے بڑی بے چینی پھیل گئی تھی۔ لیکن معاملات نے اس وقت زیادہ نازک صورت اختیار نہ کی۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس ملک میں موجودہ انقلاب ۱۹۳۰ء میں ایک سترہ سالہ چونگ ینگ (Chong Ying) نامی مسلمان نوجوان کی قیادت میں رونما ہوا۔ سائٹروین ہارٹ (Citroen Haardt) مہم کے ایک ممبر مسٹر پیٹرو (Mr. Petro) اس کمسن جنرل سے ترکستان میں ملے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں وسطی ایشیائی سوسائٹی کے سامنے ایک لیکچر کے دوران میں انہوں نے اپنے مشاہدات بیان کئے۔ اسی سال ماچونگ ینگ نے ہامی شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور محصور چینی فوجوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کرنے کے لئے مسٹر پیٹرو کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں۔ جب مسٹر پیٹرو چینی جنرل اور چینی دفاعی قونصل سے ملے تو انہیں یہ خیال تھا کہ شائد ان سے محاصرین کی فوجی طاقت اور اُن کی چالوں کے متعلق کچھ پوچھا جائے۔ لیکن اُن کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کہ جب اُن سے پہلا اور ایک ہی سوال یہ کیا گیا کہ کیا واقعی ماچونگ ینگ کی عمر صرف بیس سال ہے۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ماچونگ ینگ نے ابھی عمر کی پوری بیس منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں تو چینی جنرل نے دفاعی قونصل کی طرف جو ہتھیار ڈالنے کی موافقت میں تھا دیکھا اور کہا "میری عمر اس وقت ۸۱ سال کی ہے اور مدت سے میرے بال سفید ہیں۔ میرا بڑا پوتا بھی اس بچونگڑے سے عمر میں زیادہ ہے۔

میری عزت یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ میں اس بچے کے سامنے ہتھیار ڈال دوں "

بوڑھا جنرل بات کا دھنی نکلا۔ اس نے بھوک اور دوسری مصیبتوں کا نہایت صبر و تحمل سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ حکومت چین کی طرف سے اسے کمک پہنچ گئی۔ ایک سخت لڑائی کے دوران میں ماچونگ بُری طرح زخمی ہوا اور اسے کان سو (Kan-su) میں پناہ لینی پڑی۔ اس وقت تو لڑائی بند ہو گئی لیکن جلد ہی دوبارہ شروع ہو گئی۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ ماچونگ اس وقت بھی جنگ میں قیادت کر رہا ہے یا نہیں لیکن اس کے شاندار کارنامے جو بقول مسٹر پیٹر و موجودہ زمانے کی اوڈیسی (Odyssey) کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ چنگیز، تیمور اور بابر کا وطن اب بھی اعلیٰ درجہ کا بہادر سپہ سالار پیدا کر سکتا ہے۔

میرے خیال کے مطابق اس بغاوت کی اصل وجہ مذہبی تعصب نہیں ہو سکتی اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی تحریک میں لیڈر ہر قسم کے جذبات کو اُکساتے ہیں۔ حقیقی اسباب اقتصادی معلوم ہوتے ہیں۔

دُنیا کے لئے آج کل نسل ہی سب کچھ ہے۔ مَیں اس قسم کے نظریہ کو موجودہ تہذیب پر سب سے بدنما داغ سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کہیں ایشیا میں بھی نسلی سوال پیدا ہو گیا تو یہ بہت خطرناک نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے اسلام کی سب سے بڑی کوشش اسی مسئلہ کا حل کرنا ہے اور اگر موجودہ دور میں ایشیائی ممالک تباہ

حالی سے بچنا چاہتے ہیں تو صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظریہ کو اپنا لیں اور نسلی امتیازات کو مٹا کر انسانیت کے عام مفاد کو پیش نظر رکھیں۔

میرا یہ خیال کہ چینی ترکستان کا انقلاب کل توران کی تحریک نہ بن جائے وسطی ایشیا کے موجودہ واقعات پر مبنی ہے۔ کچھ ہی دن کی بات ہے۔ کہ افغانستان کے مشہور ماہنامے "کابل" میں ایران کے ڈاکٹر افشار کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے افغانستان کو "ایران کلاں" کا حصہ قرار دیتے ہوئے اتحاد کی دعوت دی ہے تاکہ دونوں مل کر توران کے بڑھتے ہوئے فتنہ کی روک تھام کر سکیں۔ بہرصورت یہ یقینی بات ہے کہ اگر یہ تحریک انقلاب کامیاب ہوگئی تو افغانی اور روسی ترکستان اس کے اثر سے نہیں بچ سکیں گے۔ خصوصاً موخرالذکر جہاں کچھ تو مذہبی ظلم و تعدی اور کچھ روسی حکومت کی پالیسی نے جس کے ماتحت تمام ملک کو روئی کی کاشت کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور اشیائے خوردنی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی پہلے ہی سخت بے چینی پھیلا رکھی ہے۔ جہاں تک افغانی ترکستان کا تعلق ہے مجھے یقین ہے کہ ہم اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

تحریک کی کامیابی سے ایک اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ چینی ترکستان میں جہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۹۹ فی صدی ہے ایک خوشحال اور مستحکم اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی اور اس طرح وہاں کے مسلمان

ہمیشہ کے لئے چینیوں کے برسوں کے ظلم واستبداد سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ چینی ترکستان ایک بہت زرخیز علاقہ ہے لیکن چینیوں کے ظلم واستبداد اور بدانتظامی کے سبب اس وقت صرف پانچ فی صدی علاقہ کاشت ہو رہا ہے۔

ہندوستان اور روس کے درمیان ایک اور اسلامی ریاست کے قیام سے بالشوزم، مادہ پرستی، دہریت اور بے دینی کے خطرات اگر وسط ایشیا سے مجموعی طور پر بالکل نہ مٹے تو کم ازکم ہندوستان کی سرحدوں سے اور زیادہ دُور ضرور ہو جائیں گے۔

سیاسی معاملات میں لارڈ ولنگڈن بہت ہی اعلیٰ قسم کی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی حکومت نے چینی ترکستان کے واقعات کے متعلق ایک بہت مستحسن قدم اُٹھایا ہے۔ یہ نظریہ ریاست کشمیر کی حدود کے متعلق حکومت ہند کی پالیسی کی وضاحت بھی کرتا ہے اور اس کے صحیح ہونے پر دال بھی ہے۔

ریاست کشمیر میں فسادات کے متعلق بیان

جو ۷ رجون ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا۔

کشمیر گورنمنٹ کے تازہ ترین اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ سرینگر میں اب حالات پُرسکون ہیں۔ لیکن جو اطلاع مجھے معتبر ذرائع سے ملی ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ جتنے کہ سرکاری اعلامیہ میں بتائے گئے ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ خود حکومت کشمیر کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کرنل کالونؒ کی پالیسی کو ناکام بنانے کی کوشش میں ہیں۔

حکومت کشمیر کے ایک تازہ اعلامیہ میں دنیا کو بتایا گیا تھا کہ مسلم جماعتوںؒ کے لیڈروں کی گرفتاری کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی۔ ایک معتبر خبر کے ذریعہ جو مجھے اپنے طور پر موصول ہوئی ہے اس بیان میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے پیش نظر کرنل کالون کا فیصلہ حقائق پر مبنی تھا۔ اس امر کا ثبوت حکومت کشمیر کے کابینہ کے نام نہاد متفقہ فیصلہ کے نتائج سے ملتا ہے۔

مَیں کشمیر کی کسی سیاسی جماعت کی بلاوجہ حمایت نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دونوں جماعتوں کے لیڈروں کی گرفتاری، لوگوں پر دروں کی بارش، اور عورتوں اور بچوں پر گولی چلانا اور لاٹھی چارج ایسے واقعات ہیں جو کشمیر کو پھر ان مصیبتوں میں ڈال دیں گے جن سے کرنل کالون نے اپنی حکمت عملی سے نجات دلائی تھی۔ مجھے امید ہے کہ کشمیر گورنمنٹ موجودہ واقعات کا نفسیاتی پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کرے گی اور ایسا رویہ اختیار کرے گی جس سے ریاست میں امن اور آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔

لہ وزیر اعظم ریاست کشمیر۔ ٢ہ میر واعظ یوسف اور سید محمد عبداللہ کی جماعتیں +

حال ہی میں جموں اور کشمیر کے چند مسلمان میرے اور لاہور کے چند دوسرے مسلم اکابر کے پاس کشمیر کے حالات کے متعلق مختلف خبریں لائے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کو کشمیری مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ اس چال کے پس پشت کوئی بھی ہو میں اس واقعہ کے متعلق متنبہ کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ کشمیر کمیٹی کے ارکان اتنے بیوقوف نہیں کہ وہ اس دام میں پھنس جائیں جو ان کے لئے بچھائے جا رہے ہیں۔

آخر میں میں مسلمانانِ کشمیر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کریں۔ کشمیر میں ابھی بیک وقت دو یا تین اسلامی سیاسی جماعتوں کے کام کرنے کا وقت نہیں۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندہ صرف ایک ہی جماعت ہو۔ کشمیر کو جب تک ایک سیاسی خیال پر متفقہ جماعت حاصل نہ ہوگی ریاست کے لوگوں کے مفاد کی ترقی کے لئے لیڈروں کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے متعلق بیان

جو ۲۰ رجون ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

کشمیر کمیٹی[1] میں میری صدارت محض عارضی تھی۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی

---

[1] ڈاکٹر اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر تھے۔

تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رُونما ہونے پر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا تھا اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے تھے۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہوگی ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ بہت سے ممبران نے اس لئے یہ سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہیئے اور عہدیداروں کا نیا انتخاب ہونا چاہیئے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریق کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلاف نے جس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر نے اپنا استعفا پیش کیا اور وہ منظور ہو گیا۔

پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسوّدہ پیش کیا گیا۔ جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو لیکن کچھ ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ بعد کے بحث و مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ لگا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصّوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتّحاد صرف برائے نام ہی ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفیٰ پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی اس رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی مذہبی فرقے

کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا صریحاً گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میرپور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔

میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں وہ بالکل بے تکے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ

کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔

ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان کشمیر کی رہنمائی اور مدد کے لئے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے۔ اس لئے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے ان احساسات کو آپ کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دیا ہے جنہوں نے مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ صاف گوئی کسی شخص کو ناگوار نہ گزرے گی۔ کیونکہ میرا مقصد نہ کسی کی برائی کرنا ہے اور نہ کسی پر انگلی اٹھانا۔

"تحریک کشمیر" کی صدارت کی پیشکش نامنظور کرنے کے متعلق بیان

جو ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو دیا گیا۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا صدر ہوتے ہوئے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ میں کمیٹی کے ممبران کو اس پر رائے زنی کا موقعہ دیئے بغیر اس خط کا جواب دے دوں جس میں مجھے صدارت پیش کی گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو بھی اس امر سے مطلع کر دیا تھا۔

میرے خط سے اخبارات کے بعض اہل قلم اصحاب نے جو اغلباً قادیانی ہیں یہ غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہذا مَیں جلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصُولی اختلاف نہیں بلکہ مَیں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں۔ اور میرے اس رویہ کی وجُوہات وہی ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیئے۔

یہ پیشکش جو مجھے کی گئی ہے یقیناً ایک فریب ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اس امر کے متعلق یقین دلاتا ہے کہ سابقہ کشمیر کمیٹی حقیقت میں ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو ایک جماعت کی حیثیت سے موجود ہے اور یہ کہ وہ لوگ جنہیں نئی کمیٹی سے نکال دیا گیا ہے وہ اب اس شخص کی رہنمائی میں کام کرنے کے لئے طیار ہیں جو کمیٹی کی نئی تشکیل کا سب سے بڑا محرک تھا۔

لیکن ان کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بنا پر مَیں نے کشمیر کمیٹی کی از سر نو تشکیل کرائی اب ختم ہو گئے ہیں نہ تو مجھے قائل کر سکتی ہے اور نہ مسلم عوام کو۔ قادیانی ہیڈ کوارٹرز سے ابھی اس مقصد کا کوئی واضح بیان شائع نہیں ہُوا کہ قادیانیوں کے کسی مسلم ادارہ میں شریک ہونے کی صُورت میں انکی اطاعت دو طرفہ نہ ہو گی بلکہ واقعات سے تو یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ ادارہ

جس کو قادیانی اخبارات تحریک کشمیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس میں بقول قادیانی اخبار "الفضل" مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔۔ اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے امیر کی جانب سے کئی چٹھیاں جو انہوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کے نام لکھی ہیں (غیر قادیانی کشمیری ہونے کی وجہ سے انہیں مسلمان کی بجائے بھائی کہا گیا ہے) اس قادیانی تحریک کشمیر کے چند پوشیدہ اغراض کا انکشاف کرتی ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ داری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔

کشمیر میں انتظامی اصطلاحات کے متعلق بیان

جو ۳ اگست ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

ہندوستان کے لوگ اس اعلامیہ کو خوش آمدید کہیں گے۔ اور امید ہے کہ گلانسی کمیشن کی سفارشات پر بہت جلد عمل شروع ہو جائیگا اور اس طرح حکومت کشمیر ان لوگوں کے دلوں میں جن کے لئے یہ اصطلاحات منظور کی گئی ہیں اپنا اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لئے راجا اور پرجا میں صلح اور آشتی کا ماحول ہونا نہایت ضروری ہے۔

حکومت کے لئے لازمی ہے کہ رعایا کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ لوگوں میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی غیریت اور بیگانگی کا احساس پیدا نہ ہو بلکہ وہ یہ سمجھیں کہ حکومت ہماری اپنی ہے اور اس سے وہ اپنا ہر جائز مطالبہ پورا کرنے کی توقع رکھیں۔

کرنل کالون[1] کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ حکومت اور عوام میں دوبارہ اعتماد اور اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لئے وہ میرپور اور بارہ مولا میں زیر سماعت فسادات کے مقدمات کو واپس لے لیں۔ یہ اقدام حکومت کشمیر اور یورپی وزیر اعظم کے وقار کو بڑھانے میں بہت مؤثر ثابت ہوگا اور اس طرح وہ پروپیگنڈا بھی بند ہو جائے گا جو آج کل وزیر اعظم کے خلاف ہو رہا ہے۔

پنجاب فرقہ دارانہ فیصلہ کے متعلق بیان

جو ۱۴ر جولائی ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

کہتے ہیں کہ اس فارمولے[2] کے حامیوں کا یہ متفقہ خیال ہے کہ مسلمانوں کو

---

[1] وزیر اعظم ریاست کشمیر۔

[2] چند لیڈروں نے پنجاب فرقہ دارانہ فارمولا پنجاب میں برطانوی وزیر اعظم کے فرقہ دارانہ فیصلے کی جگہ لینے کے لئے وضع کیا تھا۔ اس فارمولے میں مندرجہ ذیل خاص باتیں تھیں:-

۱۔ ہندو مسلم اور سکھ تینوں جماعتوں کیلئے حق رائے دہندگی کی شرائط اس طور پر ہونی چاہئیں کہ رائے دہندگان کی تعداد آبادی کے لحاظ سے برابر ہو۔

۲۔ انتخابات ملے جلے ہوں۔ اس مقصد کے لئے تمام صوبے کو فوراً (باقی بر صفحہ ۲۲۷)

اس فارمولے کے متعلق رائے زنی کرنے کا حق اس وقت ہوگا جبکہ ہندو اور سکھ اس سے متفق ہوجائیں۔ ہندو اخبارات اس فارمولے کے خلاف ہیں اور سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اس کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس لئے میرا تو یہ خیال ہے کہ اب اس فارمولے پر ایک سیر حاصل یا اس کے بنیادی اصولوں پر ایک مفصل تنقید کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں یہ فارمولا پنجاب میں فرقہ دارانہ مسئلہ کا حل قطعی طور پر نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی وقت یہ فارمولا متعدد جھگڑوں کا باعث بن جائے۔

وزیر اعظم کے فیصلہ کی طرح صوبے میں مختلف جماعتوں کے لئے حلقوں کو محفوظ رکھنے کے باوجود زیر غور تجویز شہری اور دیہاتی دونوں قسم کے لوگوں کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہے۔ اور اس سکیم پر عمل درآمد ہونے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دیہات کے ان لوگوں کو بھی پورا پورا حق نمائندگی نہیں ملتا جو اپنے حلقوں میں اکثریت میں ہیں۔

اس کے مختلف پہلوؤں اور ان تمام قضیوں پر جن کے پیدا ہونیکا احتمال ہے۔ غور کرنے کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سکیم برطانوی وزیر اعظم کے فیصلے کے مقابلہ میں تمام جماعتوں کے نقطہ نظر سے

قرار دیا جائے اور حلقوں میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم آبادی کے پیش نظر علاقہ وار ہو۔

۳۔ ایک علاقے میں جس جماعت کے رائے دہندگان کی اکثریت ہو وہ اسی جماعت کے ممبر کے انتخاب کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

اچھی نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سکیم ہر جماعت کے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی۔

چونکہ ہندو اور سکھ اس سکیم کے مخالف ہیں۔ اور اگر کوئی مسلمان اس کے حامی بھی ہیں تو ان کے مقاصد کو غلط بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لئے میں مخلصانہ اپیل کروں گا کہ اس فارمولے کے بنانے والے اس سے دست بردار ہو جائیں اور چونکہ یہ فارمولا کسی ایک جماعت کو بھی متاثر نہیں کر سکا اس لئے اس کو مجلس قانون ساز میں پیش کرنے سے احتراز کریں۔

کونسل آف سٹیٹ میں سر فضل حسین کے اتحاد ممالک اسلامیہ سے متعلق بیان کی وضاحت میں بیان

جو ۱۹ ستمبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

سر فضل حسین یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ اسلامی ممالک میں سیاسی اتحاد آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس قسم کے اتحاد کا وجود کبھی اس اصطلاح کے اختراع کرنے والوں کے تصوّر سے آگے نہیں بڑھا یا۔ اغلباً ترکی کے سلطان عبد الحمید خاں نے سیاسی شطرنج میں اسے مہرہ کے طور پر استعمال کیا۔ خود سید جمال الدین افغانی نے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی ممالک کے اتحاد کی تحریک میں سب سے آگے ہیں کبھی مسلمانان عالم کو متحد کر کے ایک اسلامی ریاست میں شامل ہونے کے لئے نہیں کہا۔ اور یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کسی اسلامی زبان یعنی عربی فارسی اور ترکی میں

پان اسلام ازم کا کوئی مترادف لفظ موجود نہیں ہے۔
ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نہ محض ایک سوسائٹی کی حیثیت سے بلکہ تمام قوموں اور مذاہب اسلام کو متحد کرنے کی عملی حیثیت سے نسلی، قومی اور جغرافیائی حدود کو نہیں مانتا اور انسانی بہبودی کے معنی ہیں پان اسلام ازم کا نظریہ (بلکہ اگر اختصار سے کام لیا جائے تو صرف "اسلام" ہی کہنا کافی ہوگا) موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔
مسلمانان ہند کو سر فضل حسین کا یہ مشورہ کہ وہ ایک جداگانہ ہندوستانی قوم کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں بالکل صائب ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانان ہند اس مشورہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جو آبادی کے لحاظ سے باقی تمام ایشیائی ممالک کی مجموعی مسلم آبادی سے زیادہ ہیں۔ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا سرمایہ خیال کریں اور دوسری ایشیائی مسلم اقوام کی طرح اپنے اختلافات سے کنارہ کش ہو کر اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو اکٹھا کریں اور بقول سر فضل حسین اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔

مجوزہ افغان یونیورسٹی کے متعلق بیان

جو ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا

تعلیم یافتہ افغانستان ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا۔ کابل

میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی سکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں بسنے والوں ہوشیار افغان قبیلوں کی سدھار میں بہت زیادہ ممد ثابت ہو گی۔

شاہ افغانستان نے ہمیں[1] اس لئے دعوت دی تھی کہ ہم وہاں وزیر تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مشورہ دیں۔ اعلیحضرت کی دعوت کو قبول کرنا ہم نے اپنا فرض سمجھا۔ کابل سے شائع ہونے والے مختلف جرائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا نوجوان طبقہ نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے مذہب اور تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کا بے حد خواہشمند ہے۔ افغان لوگ بہت خلیق ہوتے ہیں۔ اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں۔ اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغان لوگوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید واثق ہے۔ کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوئے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں۔ مزید برآں کسی طریقہ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ملک کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور کسی ملک کے تعلیمی مسائل کے متعلق فیصلہ کرنے میں اس ملک کی خصوصی ضروریات کو خاص طور پر مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر اقبال۔ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی۔

افغانستان کے حالات کے متعلق بیان (جو ۴ نومبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا)

سب سے پہلے جو قابل ذکر چیز ہمیں نظر آئی وہ یہ ہے کہ افغانستان میں لوگوں کے جان و مال بالکل محفوظ ہیں۔ یہ ایک ایسی حکومت کے لئے بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے جسے صرف چار سال پیشتر ملک میں عام بغاوت کو فرو کرنا پڑا ہو۔ دوسری بات جس سے ہم متاثر ہوئے وہ وہاں کے وزراء کی نیک نیتی اور اخلاص ہے جس سے وہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سخت قسم کے قدامت پسند لوگ بھی ان وزراء کے حامی ہیں اور نتیجۃً جیسا کہ ہمارے سامنے ایک مقتدر افغان عالم نے کہا آج کل افغانستان میں ملاؤں اور نوجوانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمہ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لئے پہلے ہی ایک خوبصورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے شعبہ طب قائم کیا گیا ہے اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیر غور ہے وہ سول انجنیرنگ کا ہوگا۔ رہا سڑکوں کا سوال تو کابل کو پشاور سے ملانے والی ایک نئی سڑک آئندہ دو سال کے عرصہ میں مکمل ہو جائے گی۔ اس سڑک کا نقشہ بڑے غور و فکر سے تیار کیا گیا ہے۔ روسی سرحد تک جانے والی سڑک مکمل ہو چکی ہے اور یہ سڑک اس لئے بہت اہم ہے کہ یہ وسطی ایشیا کو وسطی یورپ سے

ا۔ یہ بیان سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی اتفاق رائے سے دیا گیا۔

قریب کر دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان نے ہمیں شرف باریابی بخشا اور کافی طویل گفتگو ہوتی رہی۔ اعلیٰ حضرت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ان کا ملک پھلے پھولے اور اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح اور آشتی قائم رکھے۔

افغانستان آج ایک متحد ملک ہے جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقعہ مل جائے تو بلاشک و شبہ افغانستان کا مستقبل شاندار ہوگا۔

گول میز کانفرنس میں مسلم مندوبین کے رویہ کی وضاحت میں بیان

جو ۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا

میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں لیکن مجھے کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانی سیاستدانوں میں کمیاب ہے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویّہ

کے متعلق انہیں پورے حالات معلوم نہیں۔

پنڈت جی کا خیال ہے کہ مسٹر گاندھی نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو اس شرط پر قبول کر لیا تھا کہ آزادی کی جنگ میں مسلمان پوری امداد کا یقین دلائیں اور یہ کہ فرقہ داری سے زیادہ رجعت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس شرط کو نہیں مانا۔ لندن میں جو کچھ ہوا اس کے متعلق مذکورہ بالا بیان بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

پنڈت جواہر لعل نے فرمایا ہے کہ سر آغا خاں مسلمانوں میں سیاسی رجعت پسندی (Reactionaryism) کے سب سے بڑے محرک ہیں حقیقت اس کے بالکل برعکس ہیں کیونکہ خود سر آغا خاں نے میری اور کئی اور ہندوستانی مندوبین کی موجودگی میں مسٹر گاندھی کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہندو یا کانگریس مسلمانوں کے مطالبے مان لے تو مسلمانوں کا بچہ بچہ جنگ آزادی میں مسٹر گاندھی کے اشارے پر چلنے کے لئے طیار ہوگا۔

مسٹر گاندھی نے آغا خاں کے الفاظ پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد مسلم مطالبات منظور کر لینے کی پیشکش کی جس میں جگہ جگہ شرائط اور قیود تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کے مطالبات کو صرف ذاتی طور پر مانیں گے اور بعد ازاں وہ کانگریس سے وہ اپنے مطالبات تسلیم کرانے کی کوشش کریں گے لیکن وہ اس ضمن میں کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتے میں نے اُن سے درخواست کی وہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ کو تار دے کر اپنی پیشکش کی تائید حاصل کر لیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے

فرمایا کہ کانگریس اس مسئلہ میں کبھی انہیں کلی اختیارات دینے کے لئے طیار نہ ہوگی۔

اگر پنڈت جواہر لعل نہرو پسند کریں تو مسز سروجنی نائیڈو سے جو اس وقت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں معلوم کر سکتے ہیں کہ گاندھی جی کے رویہ کے متعلق انہیں میرے ساتھ اتفاق ہے یا نہیں۔ گاندھی جی سے پھر کہا گیا کہ از کم ہندو اور سکھ مندوبین سے ہی وہ اپنی پیشکش کی تائید کرالیں۔ اس پر گاندھی جی نے کوشش تو ضرور کی لیکن وہ ناکام رہے اور پرائیویٹ طور پر ان لوگوں کے رویہ کے متعلق مایوسی کا اظہار کر دیا۔

مسٹر گاندھی کی دوسری اور غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات اور بالخصوص نمایندگی میں خاص مراعات کے مطالبے کی حمایت نہ کریں۔ اس کے جواب میں مسٹر گاندھی کو بتا دیا گیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ شرط اس لئے قابل قبول نہیں کہ وہ خود اس قسم کے مطالبات پیش کر رہے ہیں۔ البتہ اگر مسٹر گاندھی اچھوتوں سے اپنے طور پر اس بارے میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

لیکن مسٹر گاندھی اپنی شرط پر اڑے رہے۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اپنے زبان زد عام سوشلسٹ خیالات کے پیش نظر پنڈت جواہر لعل نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمایت کریں گے۔

یہ ہیں اصل واقعات مسٹر گاندھی اور مسلم مندوبین کے درمیان مذاکرات کے۔ اس گفت و شنید کی ناکامیابی کی اصل وجہ مسلمان مندوبین

کی سیاسی رجعت پسندی تھی یا دوسروں کی سیاسی تنگ نظری" اس سوال کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو خود ہی دیں۔

ہز ہائی نس آغا خاں نے دو سال ہوئے جو پیشکش کی تھی وہ اب تک قائم ہے۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں ہندو یا کانگریس مسلمانوں کے ان مطالبات کو جنہیں وہ کل ہند اقلیت ہونے کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، مان لیں تو مسلمان اب بھی بقول آغا خاں جنگ کی آزادی میں ہندوستان کی اکثریت والی قوم کے لشکر کے ساتھ ادنیٰ خدمتگزاروں کی حیثیت سے شریک ہونے کے لئے تیار ہیں لیکن اگر یہ پیشکش پنڈت جی کو قبول نہیں تو کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا متہم قرار دیں۔ اس صورت میں وہ لوگ جو ہندوؤں کی فرقہ داری کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہونگے کہ پنڈت جی فرقہ دارانہ فیصلہ کے خلاف ہندو مہا سبھا کی جاری کردہ مہم کے ایک سرگرم رکن ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف پنڈت جواہر لال کا دوسرا الزام یہ ہے کہ ان میں چند ایک قطعی طور پر اصولِ قومیت کے منکر ہیں۔ اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتیاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں خود ہی نظریہ قومیت کے انکار کا مجرم ہوں۔ میرے خیال کے مطابق ہندوستان کے خصوصی حالات کے پیش نظر ان معنوں میں یہاں ایک قوم کی تشکیل ناممکن ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے اور پھر

ان معنوں میں تو قومیت کے سب سے بڑے مخالف مسٹر گاندھی ہیں جنہوں نے اچھوتوں کو دوسری جماعتوں کے ساتھ مدغم ہونے کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنایا ہوا ہے اور جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان کسی قسم کا اصلی اتحاد پیدا کئے بغیر ہی ان کو ہندوؤں کا ایک حصہ سمجھا جائے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مسٹر گاندھی کا اچھوتوں سے پیغام یہ ہے: "ہندو دھرم کو مت چھوڑو۔ ہندو مت میں رہو لیکن ہندو بننے کی کوشش نہ کرو۔"

لیکن ایک ایسے شخص کو جو اصول قومیت کا ان معنوں میں مخالف ہو کہ مختلف مذہبی جماعتیں اپنی انفرادیت نہ کھو بیٹھیں لازمی طور پر قومیت کا دشمن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اس لئے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے کئی مفاد بدیہی طور پر مشترک ہیں اور جہاں تک ان مشترک مفاد کا تعلق ہے مختلف جماعتوں میں کسی نہ کسی سمجھوتہ کا امکان ضرور ہے۔ بلکہ میرا تو یہ یقین ہے کہ اس قسم کا سمجھوتہ لازمی طور پہ ہو کر رہے گا۔ موجودہ حالت ملک کی سیاسی ترقی کی راہ میں ایک لازمی منزل ہے۔ ہمیں ایک متحد ہندوستان کی بنیاد ٹھوس حقائق پر رکھنی ہوگی یعنی یہ کہ اس ملک میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ جتنی جلدی بھی ملک کے سیاستدان واحد قومیت کے خیال کو جس کا مطلب مختلف جماعتوں کو حیاتی طور سے مدغم کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ترک کر دیں ہم سب کے لئے اسی قدر اچھا ہے۔

پنڈت جواہر لال کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مذہبی طور

پر تو جمہوریت کے قائل ہیں لیکن عملی طور پر اس سے خالف ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جداگانہ انتخابات اور دوسری تمام حفاظتی تدابیر جن پر مسلمان مصر ہیں ان کا واحد مقصد یہی ہے کہ نسبتاً غریب اور پس ماندہ جماعت کے آٹھ کروڑ مسلمان جمہوریت کے حقیقی فائدوں سے بالکل محروم نہ کر دیئے جائیں۔ مسلمان حفاظتی تدابیر اس لئے نہیں چاہتا کہ وہ جمہوری نظام سے خالف ہے بلکہ اس لئے کہ وہ جمہوریت کی آڑ میں کسی ایک مذہبی جماعت کے غلبہ سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں جمہوریت کے قیام کا خواہاں ہے خواہ اس کے لئے اسے جمہوریت کی ظاہری شکل ہی کو قربان کرنا پڑے۔

پنڈت جی نے ہز ہائی نس آغا خاں، ڈاکٹر شفاعت احمد اور میری ان تقاریر کی طرف اشارہ کیا ہے جو دار العوام کے بہت سے ممبران کے سامنے کی گئی تھیں۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وہ بیانات جو ہماری طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اس قسم کی دلیل میں ہماری تقاریر کے اصل متن کی بجائے کسی اخباری نمائندہ کے تاثرات کا حوالہ دینا بالکل بے معنی ہے۔ کوئی ہندوستانی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ہندوستان میں نظام حکومت انگریز کے بغیر نہیں چل سکتا۔

آخر میں میں پنڈت جواہر لعل سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم

تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرلے بلکہ واحد قومیت کی ایسی رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں۔ یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیش نظر اس طرح تقسیم کرنا ہوگا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے۔

فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کانگریس کے نظریہ کی وضاحت میں بیان

جو ۱۹ر جون ۱۹۳۴ء کو شائع ہوا۔

کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام مذہبی جماعتوں کی یکساں طور پر نمائندگی کرتی ہے اور چونکہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق ہندوستان میں اختلاف رائے ہے اس لئے نہ تو وہ اسے تسلیم ہی کرتی ہے اور نہ ہی اسے نامنظور کرتی ہے۔ لیکن فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق کانگریس کا تبصرہ انکار ہی کے برابر ہے۔ حالانکہ اپنے دعویٰ کے مطابق کانگریس کو اس فیصلہ کے متعلق کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جان بوجھ کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اگرچہ اس فیصلہ کو قرطاس ابیض میں

شامل کر دیا گیا ہے لیکن اس کا حشر اس کے ساتھ وابستہ نہیں۔ بلکہ اس کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ قرطاس ابیض کے دوسرے حصے صرف تجاویز ہیں لیکن فرقہ دارانہ فیصلہ ایک طے شدہ امر کی حیثیت رکھتا ہے جو برطانوی وزیر اعظم نے ان ہی لوگوں کی درخواست پر کیا تھا جو آج اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اپنی قرارداد میں کانگریس نے اپنی فرقہ دارانہ ذہنیت کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن اس فعل نے انکی چالوں کو اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ کوئی مسلمان ان کے دھوکے میں نہیں آسکتا اس نازک موقعہ پر میں مسلمانان ہند کو مشورہ دونگا کہ باوجودیکہ فرقہ دارانہ فیصلہ میں ان کے تمام مطالبات کو پورا نہیں کیا گیا وہ پامردی کے ساتھ اس کی حمایت کریں۔ ایک باعمل قوم کی حیثیت سے وہ صرف یہی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔

تقسیم فلسطین کی حمایت میں رپورٹ کے متعلق بیان

جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے زیر اہتمام عام جلاس

منعقدہ لاہور میں ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو پڑھا گیا۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس جلسہ عام میں جو مسلمانان لاہور آج فلسطین رپورٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے منعقد کر رہے ہیں شمولیت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں مسلمانوں کو یقین دلانا

چاہتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ ناانصافی کا مجھے اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مشرق قریب کی صورت حالات سے واقف کسی شخص کو ہو سکتا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اہل برطانیہ کو اب بھی ان وعدوں کے ایفا پر مائل کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی طرف سے عربوں سے کئے گئے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے اپنی ایک تازہ بحث میں ملک معظم کی حکومت کے فیصلہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے مسئلہ تقسیم فلسطین کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ اسی فیصلہ سے مسلمانان عالم کو ایک موقع ملتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ جس کے حل کے برطانوی سیاست دان متلاشی ہیں۔ محض فلسطین ہی کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو تمام دنیائے اسلام پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوگا۔

مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جاوے تو فلسطین میں یہود کا مسئلہ تو تیرہ سو سال ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یروشلیم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ہوگنگ لکھتے ہیں یہود اپنی مرضی اور ارادے سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب ہوا۔ مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے پیٹر دی ہرمٹ کی ہستی ہی کو مشتبہ قرار دے دیا ہے۔ بالفرض اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ صلیبی جنگیں فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کی کوشش

تھیں تو اس کوشش کو صلاح الدین کی فتوحات نے ناکام بنا دیا۔ لہٰذا
میں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہوں۔

مشرق قریب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے
کبھی بھی اس طرح بے نقاب نہیں ہوئے تھے جیسے رائل کمیشن کی رپورٹ
میں فلسطین میں یہود کے لیئے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے
حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل
سیادت کی شکل میں اپنے لیئے ایک مقام کی تلاش میں ہے۔ پارلیمنٹ کے ایک
ممبر کے قول کے مطابق یہ ایک خطرناک تجربہ ہے اور اس سے برطانوی مسئلہ کا
بحیرہ روم کا حل میسر نہیں آتا۔ برطانوی مشکلات کا حل ہونے کی بجائے یہ
تو برطانوی امپیریلزم کے لیئے آنے والی مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔ ارض مقدس
جس میں مسجد عمر بھی شامل ہے کی مارشل لا کی دھمکی کے ماتحت جس کے ساتھ
ساتھ عربوں کی مروت کا قصیدہ بھی پڑھا گیا ہے فروخت برطانوی سیاست
کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے تدبر کا ماتم ہے۔ یہودیوں کو زرخیز زمین
اور عربوں کے لیئے کچھ نقدی اور پتھریلی اور بنجر زمین کی پیشکش کوئی سیاسی
دانائی نہیں۔ یہ تو برطانوی تدبر کی شان سے گرا ہوا ایک نہایت ہی گھٹیا
سودا ہے جو اس نامور قوم کے لیئے باعث ندامت ہے جس کے نام پر عربوں
سے آزادی اور اتحاد کے قطعی وعدے کیئے گئے تھے۔

میرے لیئے ناممکن ہے کہ اس مختصر بیان میں فلسطین رپورٹ کے مختلف پہلوؤں
سے بحث کر سکوں لیکن تازہ تاریخی حالات میں یہ رپورٹ مسلمانان ایشیا

سے لئے بڑی بڑی عبرتوں کی سرمایہ دار ہے۔ تجربہ نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد مکرر سے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ ترکوں کو باقی ماندہ دنیائے اسلام سے علیحدہ کر دینے کی پالیسی ابھی تک جاری ہے۔ گاہے گاہے یہ بھی صدا بلند ہوتی ہے کہ ترک تارک اسلام ہو رہے ہیں۔ ترکوں پر اس سے بڑا بہتان نہیں باندھا جا سکتا۔ اس شرارت آمیز پراپیگنڈے کا شکار وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو اسلامی فقہ کی تاریخ سے نابلد ہیں۔

اہل عرب کو جن کا شعور مذہبی ظہور اسلام کا موجب بنا۔ اور جس نے مختلف اقوام ایشیا کو ایک حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ متحد کر دکھایا۔ ترکوں سے ان کی مصیبت کے زمانے میں غداری کے نتائج سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔

ثانیاً عربوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اب وہ ان عرب بادشاہوں پر اعتماد نہیں کر سکتے جو مسئلہ فلسطین کے متعلق ایک آزادانہ اور ایماندارانہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ عربوں کا فیصلہ پورے غور و خوض کے بعد ایک آزاد فیصلہ ہونا چاہیئے جس کے لئے انہیں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر پوری پوری ضروری معلومات میسر ہونی چاہئیں۔

ثالثاً، موجودہ زمانہ ایشیا کی غیر عربی اسلامی سلطنتوں کے لئے بھی ایک ابتلا و آزمائش کا دور ہے۔ کیونکہ تنسیخ خلافت کے بعد مذہبی اور سیاسی

ہر دو نوعیت کا یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے جو تاریخی قوتیں اس کے سامنے لا رہی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسئلہ فلسطین مسلمانوں کو بالآخر اس متحدہ انگریزی فرانسیسی ادارے جس کو رسمی طور پر جمعیت اقوام کہا جاتا ہے کے متعلق بغور سوچنے اور ایک ایشیائی جمعیت اقوام کے قیام کے لئے عملی ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کرے۔

شعبۂ تحقیقات اسلامی کے قیام کی ضرورت پر بیان

(۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو شائع ہوا)

مَیں سر سکندر حیات خان کا نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے انٹر کالجیئیٹ مسلم برادر ہڈ لاہور کو پیغام دیتے ہوئے میرے متعلق بہت مشفقانہ رائے کا اظہار کیا۔

مَیں ان کی اس تجویز پر کہ میرے کلام کے ناظرین اور میری تصانیف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مجھے ایک تھیلی پیش کریں، کچھ ضرور کہنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال کے مطابق عوام کی ضروریات بحیثیت مجموعی کسی ایک فرد واحد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہیں، خواہ اس کی تصانیف عامۃ الناس کے لئے روحانی فیضان کا ذریعہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک شخص اور اس کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں لیکن عوام اور ان کی ضروریات ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

مقامی اسلامیہ کالج میں اسلامیات کے متعلق طرز جدید پہ تحقیقی شعبہ کا قیام صوبے کی اہم ترین ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان کے کسی صوبے میں اسلامی تاریخ، الہیات، فقہ اور تصوف سے لاعلمی کی وجہ سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا گیا جتنا پنجاب میں۔

یہ بہترین وقت ہے کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا غائر مطالعہ کرکے لوگوں پر واضح کیا جائے کہ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے اور کس طرح اس خول نے جو موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر پر چھایا ہوا ہے اسلامی اصولوں اور خیالات کو دبا دیا ہے۔ اس خول کو فوراً دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نئی پود کا ضمیر اس آلائش سے پاک ہو کر فطری اور آزادانہ طریق پر پرورش پا سکے۔

اس قسم کے ادارے سے اب بھی مسلمان کافی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں کیونکہ اسلام ایشیائی قوموں کی زندگی میں بڑا اہم جزو ہے اور رہا ہے۔ اور بنی نوع انسان کی مذہبی اور عقلی ارتقا میں اس کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ وزیر اعظم میری تجویز سے اتفاق کریں گے اور اپنے رسوخ کو استعمال میں لاکر اس تجویز کو کامیاب طور پر عملی جامہ پہنائیں گے۔ میں اس فنڈ میں سو روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔

سالِ نو کا پیغام

جو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن سے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو نشر کیا گیا۔

دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خون ریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال

پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ اُن کا لہو چیتی رہے۔

جو سال گذر چکا ہے اس کو دیکھو اور نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی دُنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش۔ ہسپانیہ ہو یا چین[1] ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا ہی میں یوم حشر آن پہنچا ہے، ہر شخص نفسی نفسی کہہ رہا ہے اور کسی دوسرے کے لئے محبت اور ہمدردی کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام

---

[1] یہاں اطالیہ کے حبش پر حملے، فلسطین میں بد امنی جو پیل کمیشن کی رپورٹ جس نے اس ملک کی تقسیم کی سفارش کی تھی کی وجہ سے پھیل گئی تھی، ہسپین میں خانہ جنگی اور جاپان کی چین کے خلاف فوج کشی کی طرف اشارہ ہے۔

ناممکن بنا دیں۔ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائیگا۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہونگے۔

بدیں حالات ہمیں نئے سال کی ابتدا اس دُعا کے ساتھ کرنی چاہیئے کہ خداوند کریم حاکموں کو انسانیت اور بنی نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔

اسلام اور قومیت پر مولانا حسین احمد کے بیان کا جواب

جو روزنامہ "احسان" لاہور میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا

میں نے اپنے شعر؎

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

میں لفظ "ملت" "قوم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی۔ فارسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "ملت" "قوم" کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم "ملت" بمعنی "قوم" ہی استعمال کیا ہے لیکن چونکہ لفظ "ملت" کے معنی زیر بحث مسائل پر چنداں موثر نہیں ہیں اس لیے میں اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہی تھا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جاتے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے

اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں۔ ایسے مشورے سے "قومیت" کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس کا ایک اہم پہلو یہی ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے ازبس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ مقصود ہے۔ حاشا وکلا! میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر کتنا عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے۔ اب علما اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریے ان کے لئے جاذب نظر ہیں۔ مگر افسوس!

نہ گردد کعبہ را رخت حیات
گر از افرنگ آید لات و منات

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "اقوام اوطان سے

بنتی ہیں"۔ قابل اعتراض نہیں اس لئے کہ قدیم الایام سے "اقوام"، "اوطان"
کی طرف اور "اوطان"، "اقوام"، کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔
ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کرۂ ارضی کے اس
حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذالقیاس
چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا
ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اور اس حیثیت سے اسلام سے
متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تک اہل
برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری
طور سے اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی لیاقت کے اس کے
لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حُبّ
الوطن من الایمان کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس
کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے
جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں مگر زمانہ حال کے
سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول
ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔
چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب
لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام
سے متصادم ہو رہا ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو طیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔ اس کلیہ سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے یا ہندوستان کی مختلف قومیں یا ملتیں ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں وغیرہ وغیرہ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب کے قول کے مذہبی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔

اسلام کے مذکورہ بالا دعویٰ پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن۔ سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلامی کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں۔ بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی

تھا۔ جیسے مصریوں - یونانیوں اور ہندیوں کا - بعد میں "نسلی" قرار پایا
جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ "دین" انفرادی اور پرائیویٹ
ہے - جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ
عقائد کا نام ہے - اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف
"سٹیٹ" ہے - یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے
پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے - نہ انفرادی اور پرائیویٹ
بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے
عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے - ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا
نہیں کیا جا سکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات
پر ہی مبنی کہا جا سکتا ہے - صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی
کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو
سکتی ہے - جو ایک امّت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے
کیا خوب کہا ہے مولانا رومی نے :-

ہمدلی از ہم زبانی بہتر است

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی
اور شرفِ انسانی کے خلاف ہوگی - چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے
ہے جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ
علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر پیدا ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس
کیا قرار پائے - ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی - انہوں نے

یہ اساس "وطن" کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے اُن
کے اس انتخاب کا؟ لوتھر کی "اصلاح" "غیر سلیم" "عقلیت" کا دور اور اصولِ
دین کا "سدباب" کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ۔ یہ تمام قوتیں یورپ
کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی
طرف۔ کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اس تجربہ کا اعادہ
ہو۔ مولوی صاحب زمانہ حال میں قوم کے لئے وطن کی اساس ضروری سمجھتے
ہیں۔ بے شک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے۔ مگر صاف ظاہر
ہے کہ یہ کافی نہیں بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں جو اس قسم کی قوم کی تشکیل
کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً دین کی طرف سے بے پروائی۔ سیاسی روزمرہ
مسائل میں انہماک اور علیٰ ہذا القیاس۔ اور دیگر موثرات جن کو مادیت اپنے
ذہن سے پیدا کریں۔ تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی
پیدا ہو سکے۔ مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر ایسی
قوم میں مختلف ادیان و ملل ہوں تو بھی رفتہ رفتہ وہ تمام ملتیں مٹ جاتی
ہیں۔ اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک رہ جاتی ہے۔
کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو دین کو انسانی زندگی کے لئے ضروری
جانتا ہے نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورت حالات پیدا ہو۔ باقی
رہے مسلمان۔ سو افسوس ہے کہ ان سادہ لوگوں کو اس نظریہ وطنیت کے
لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب
میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں۔

تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

مگر جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ وقّت نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے میں امّید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے امّت محمدیہ کیلئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ "قوم" استعمال کیا یا لفظ "ملّت" یہ بحث ضروری ہے۔ ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو ان کے تصوّرات میں امّت محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دلشکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا ہے لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا انہوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ملّت اور قوم کے لغوی فرق اور امتیاز سے کیا تسلّی ہو سکتی ہے؟ ملّت کو قوم سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفّی کا باعث تو ہو سکے جو دینِ اسلامی کے حقائق سے ناواقف ہیں واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور

ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور۔ دوسرا یہ کہ ان کے نزدیک قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں اس لئے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ کا فرق ہے ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اور جس کے اختیار کے لئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں۔

یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم تصور نہ کرو۔ اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔ مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ میں نے لفظ ملت اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا۔ میں ملت کو وطنی قوم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گویا اگر قوم زمین ہے تو ملت بمنزلہ آسمان ہے۔ لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرمایا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم قومیت کو آسمان بناؤ۔ دین فطرت زمین بنتا ہے تو بننے دو۔ مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا، مجھے زبان عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر آنکھوں

پہ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے۔ اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریے کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب :-

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفا کی۔ کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا۔ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا؟ آیات قرآن میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے؟ اور کیا جماعت محمدیہ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ امت بھی آیا ہے یا نہیں۔ کیا ان الفاظ کے معنی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معنی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ نوامیس الٰہیہ کی پابند ہو اور ملکی اور وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی تابع ہو جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی وہ بہت حد تک درست ہے قوم کے معنی جماعۃ الرجال فی الاصل دون النساء گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں قوم

موسیٰ اور قوم عاد کے الفاظ آئے ہیں وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ملت کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں۔ لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان:۔

اوّلاً اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معروف جماعت ہیں جسکی اساس توحید اور ختم نبوّت پر ہے یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک یا رنگ و نسان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام و قانون کے ماتحت کوئی اور ہیئت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟

ثانیاً۔ کیا ان معنوں میں بھی قرآن حکیم نے اپنی آیات کو کہیں لفظ قوم سے تعبیر کیا ہے یا صرف لفظ مِلّت یا اُمّت ہی سے پکارا گیا ہے۔

ثالثاً۔ اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے۔ کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ۔ یا اس کا اتباع کرو یا یہ دعوت صرف مِلّت کے اتباع اور اُمّت میں شمولیت کی ہے؟

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن حکیم میں جہاں جہاں "اتباع" و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ مِلّت یا اُمّت وارد ہوتا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ مِلّت نام ہے ایک دین کا۔ ایک شرع و منہاج کا۔ قوم چونکہ کوئی شرع و دین نہیں۔ اس لئے اسکی طرف دعوت اور اس سے تمسّک کی

ترغیب عبث تھی۔ کوئی گروہ ہو خواہ وہ قبیلہ کا ہو، نسل کا ہو، ڈاکوؤں کا ہو، تاجروں کا ہو۔ ایک شہر والوں کا ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو وہ محض گروہ ہے رجال کا یا النساؤں کا۔ وحی الٰہی یا نبیؑ کے نقطہ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قوم نوح۔ قوم موسیٰ۔ قوم لوط۔ لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اسکی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد۔ قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جاویں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسیٰ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی۔ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے توحید تسلیم کرتے گئے وہ اس پیغمبر کی ملت میں آگئے اس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہو سکتی ہے إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔ الخ۔ قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملت ابراہیمی میں داخل ہو گئے ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا۔ بلکہ امت کے لفظ سے۔ ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم

ہیں مسلمانوں کے لئے اُمّت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا ہو تو ارشاد فرمائیے۔ قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن مِلّت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا مِلّت یا اُمّت جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔ عہد حاضر کے ہندوستان کے علمار کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبیؐ امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم سب سے پہلے پیغمبر تھے جنکی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موحد و مشرک، اس وقت سے لیکر دو ہی مِلّتیں دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی مِلّت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوت اسمٰعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس مِلّت کے بانیوں کی وہ دُعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بُنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ کیا خدا کی بارگاہ سے اُمّت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی۔ انگریزی مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ اُمّت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی مِلّت ہے اور وہ الکفرۃ ملۃ، واحدہ کی ہے۔

امّت مسلمہ جس دین کی حامل ہے اس کا نام دین قیّم ہے۔ دین قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ حرف دین ہی مقوم ہے اس گروہ کے امور معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامقبول و مردود ہے۔

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کیلئے قابل غور ہے۔ اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور انکی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دین قیم اور امّت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ یا ان کو کسی دوسری ہیئت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امّت مسلمہ کو ہی آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آئی۔ محمدؐ (فداہ امی وابی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ انکی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک ونسب کے گرفتار تھے اب ملک ونسب ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کہ پنجۂ زو ملک ونسب را | نہ داند نکتۂ دین عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمد | نہ دادے دعوت دیں بولہب را

حضور رسالتمآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرمانے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضور نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اسمیں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوستی کی راہ ہوتی لیکن نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جسکی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو با وجود شعوب قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیجاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں "ابدیت" سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ اسکی بلندیوں تک پہنچنے تک معلوم نہیں حضرت انسان

کو کتنی صدیاں لگیں مگر اسمیں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے انکو یکرنگ کرنے میں اسلام نے وہ کام تیرہ سو سال میں کیا ہے جو دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہ ہو سکا۔ یقین جانیئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بتعبیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنیکی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلم عظیم ہے بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

مولانا حسین احمد کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدیر "احسان" سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ ملت اسلامیہ شرف انسانی اور اخوت بشری پر موسس ہے بہت سے مسلمانوں کیلئے تعجب خیز ہوگا لیکن میرے لئے چنداں تعجب خیز نہیں۔ اسلئے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آجائے جسکی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدرتاً افکار حرکت کرتے ہیں اس خیال کی طرف کہ بنی نوع انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے اس دوسری گمراہی سے جو وطنیت سے پیدا ہوتی ہے۔ ادیان کی اضافیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کیلئے خاص ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

یہ ہے نفسیاتی تجزیہ اس تیرہ بخت مسلمان کا جو اس روحانی جذام میں گرفتار ہو جائے۔ باقی رہا نص کا معاملہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کیلئے نص ہے۔ الفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کیگئی ہے یعنی یہ کہ اسکی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کیلئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔
انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ایک نامتناہی سلسلہ ہے باہم آدیزیوں کا، خونریزیوں کا اور ہمانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی ملّت قائم ہوسکتی ہے جسکی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو۔ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہوسکتی ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبّر کا کرشمہ نہ سمجھیئے بلکہ یہ رحمۃ اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خودساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جسکو "اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ" کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر "شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ" کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔
حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے اذکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکار خاتمیت کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کیلئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ

جسکو قانون الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوّت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اسکی انتہا نبوت محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکار ختمیّت الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے جس کی توضیح صرف اس وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمانوں اور بالخصوص انکے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کریگا۔

اس مضمون کو میں خاقانی کے ان دو شعروں پر ختم کرتا ہوں جن میں اُس نے اپنے ان معاصر حکمائے اسلام کو مخاطب کیا ہے جو حقائق اسلامیہ کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں بیان کرنا فضل و کمال کی انتہا سمجھتے ہیں۔ تھوڑے سے معنوی تغیّر کے ساتھ یہ اشعار آج کل کے مسلمان سیاسی مفکرین پر بھی صادق آتے ہیں۔

مرکبِ دیں کہ زادۂ عرب است   داغِ یونانش بر کفل منہید
مشتے اطفال نو تعلیم را   لوحِ ادبار در بغل منہید